PDF Compressor Free Version

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

نائب صدور

جناب سلطان اختر

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

مدیر

مشتاق احمد نوری

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

Mob. 09431080070

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۳۷ شمارہ : ۷

جولائی ۲۰۱۶ء

زرتعاون : دس روپے

سالانہ : سو روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

''زبان و ادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

email : zabanoadabbua@gmail.com

buapat2014@gmail.com

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.org

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

PDF Compressor Free Version

ترتیب

اداریہ

بیاد جوگندر پال

حرفِ آغاز	مشتاق احمد نوری	۳
جوگندر پال کے افسانے: ''مٹی کا ادراک'' کے حوالے سے	دیپک بدکی	۵
صوفی صفت افسانہ نگار: جوگندر پال	بدنام نظر	۱۳
عہد ساز افسانہ نگار: جوگندر پال	احمد علی جوہر	۱۷
جوگندر پال: فسانۂ حیات اور چند افسانے	سلمان عبدالصمد	۲۰

مقالات

کرشن چندر: کچھ یادیں کچھ باتیں	ڈاکٹر نریش	۲۶
شہزاد معصومی کا شعری امتیاز	ڈاکٹر محسن رضا رضوی	۲۸
کلام اقبال میں عورت	ڈاکٹر رضوان احمد اعجازی	۳۲
پروفیسر حسن آرزو کی ادبی اور علمی خدمات	علی ابراہیم آرزو	۳۷
حالی کی تنقید نگاری: مقدمہ کی روشنی میں	ارشد حسن	۴۰

افسانے

کریلے	ڈاکٹر نگہت نسیم	۴۳
زخم اور مرہم	شاکر کریمی	۴۵
مہمیز	راجہ یوسف	۴۹

منظومات

تین سطری نظمیں	علیم صبا نویدی	۵۳
کہیں دہائی جا رہی ہے ایک چیخ.....	تبسم فاطمہ	۵۴
نئی صدی کا چراغ	منور دانا پوری	۵۵
غزلیں	سلطان اختر	۵۶
غزلیں	ظفر اقبال ظفر	۵۷
غزلیں	علینا عترت	۵۸
غزلیں	ڈاکٹر ذکی طارق	۵۹
غزلیں	شارق عدیل	۶۰
غزلیں	ڈاکٹر منصور خوشتر	۶۱

کتابوں کی دنیا

رات کا منظر نامہ	ابرار مجیب	مبصر: صدف اقبال	۶۲
آسماں تہہ خاک	احمد جاوید	مبصر: خالد عبادی	۶۴

ہماری سرگرمیاں

سرحد پار کے معروف شاعر اسلم راہی کی بہار اردو اکادمی میں تشریف آوری	۶۷
رضا اشک سنتی پوری کو اکادمی کی جانب سے خصوصی مالی اعانت	۶۷
''اوراقِ حیات'' کے اجرا کی تقریب میں مقتدر شخصیات کی شرکت	۶۸

سلام و پیام

ڈاکٹر شائستہ انجم نوری، ڈاکٹر ثاقب انور، نشاط اختر، ایم۔ نظیر حسن، محمد پرویز اختر، عترت فاطمہ	۷۰

بچوں کا زبان وادب

۷۳ — ۸۰

PDF Compressor Free Version

اداریہ

حرف آغاز

جوگندر پال کا نام ذہن میں آتے ہی ایک صوفی منش شخصیت کا چہرہ ذہن میں ابھرنے لگتا ہے۔ جوگندر پال زندگی بھر ادب سے وابستہ رہے۔ انہوں نے بغیر کسی لاگ لپٹ کے اپنے آپ کو فکشن کی دنیا کا ایک کردار بنایا اور اسی میں وہ آخری وقت تک ڈوبے رہے۔ جوگندر پال نے اپنے آپ کو کسی گروپ سے وابستہ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی ان کا پی۔ آر۔ او۔ رہا جو ان کی حمایت میں جھنڈے بلند کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جو پزیرائی ہونی تھی، وہ نہیں ہوسکی۔ یہ بہار اردو اکادمی کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے اپنا سب سے بڑا ایک لاکھ اکیاون ہزار کا ''شاد عظیم آبادی'' ایوارڈ ان کی زندگی میں ہی انہیں دیا۔ وہ بہت خوش تھے اور ان کی بیگم محترمہ کرشنا پال نے بتایا کہ یہ ساری رقم اتفاق سے ان کے علاج میں ہی صرف ہوئی، ورنہ ان کا یہ معمول تھا کہ جو رقم بھی ان کے پاس ہوتی وہ اسے ضرورت مندوں میں تقسیم کردیتے۔ مرنے سے قبل میری ان سے فون پر گفتگو ہوئی تھی اور میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں ۲۷ اپریل کو ان سے ملنے آؤں گا، لیکن قضا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میری بدقسمتی، جب میں وہاں پہونچا، اس سے کچھ روز قبل ہی وہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور مسز کرشنا پال نے بہت تفصیل سے ان کے حالات کی جانکاری دی۔

میری پہلی ملاقات جوگندر پال سے جب ہوئی تھی، وہ ۱۵، اگست کی تاریخ تھی اور مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں دہلی میں رہ کے، لال قلعہ پر وزیراعظم کو ترنگا لہراتے ہوئے دیکھوں یا جوگندپال سے ملوں۔ میں نے جوگندر پال سے ہی ملنا مناسب سمجھا اور انہیں فون کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ اس وقت کہاں ہیں؟ میں نے بتایا کہ میں جامع مسجد بس اسٹینڈ کے سامنے ہوں، پھر انہوں نے کہا کہ آپ فلاں نمبر کی بس پکڑ لیں اور کالکاجی آجائیں، وہیں "مندا کنی اینکلو" ہے، آپ میرے گھر کا نمبر دریافت کرکے آسانی سے پہونچ جائیں گے۔

میرے بل بجانے پر انہوں نے ہی دروازہ کھولا اور مجھے یوں سینے سے لگالیا جیسے ہماری برسوں کی ملاقات رہی ہو، پھر وہ محبت سے اپنے اسٹڈی روم میں لے گئے اور ان سے ڈھیر ساری گفتگو ہوتی رہی۔ انہوں نے اپنی کتابوں کے علاوہ بہت سی وہ کتابیں بھی عنایت فرمائیں جسے لوگوں نے ان کے پاس بھیجا تھا اور وہ اسے پڑھ چکے تھے۔ دو بجے انہوں نے کرشنا پال سے کھانا لگانے کی گزارش کی جس کی انہوں نے تعمیل کی، لیکن پال صاحب سے محبت بھری شکایت کرتے ہوئے یہ بھی کہنے لگیں کہ پال صاحب کی یہ عجیب عادت ہے کہ وہ کسی مہمان کی آمد پر کچھ نہیں کہتے۔ صرف وقت پر فرمائش کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے پہلے کہا ہوتا تو میں کچھ اہتمام کرلیتی۔ میں پال صاحب کے ساتھ پانچ بجے تک بیٹھا رہا۔ طبیعت کی سیرابی نہیں ہورہی تھی، لیکن دل پر جبر کرکے مجھے واپس ہونا پڑا۔

پال صاحب کی اس پہلی ملاقات کا تاثر مجھ پر ہمیشہ قائم رہا۔ ''انجمن ترقی اردو بہار'' میں پروفیسر عبدالمغنی صاحب نے ایک فکشن سمینار کا انعقاد کیا تھا جس میں جوگندر پال بھی تشریف لائے تھے۔ میں نے اپنا افسانہ ''بند آنکھوں کا سفر'' پڑھا تھا جس کی پال صاحب نے بہت تعریف کی اور انہوں نے بتایا کہ اس کہانی نے مجھے فلاں موڑ پر ایسا جکڑا کہ میں وہیں کا ہوکر رہ گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کا مجھے ٹھیک سے علم نہیں، پھر انہوں نے فرمایا کہ اچھی کہانی کی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے قاری کو اپنی پکڑ سے آزاد نہ ہونے دے۔

PDF Compressor Free Version

نوے کی دہائی کے آخری حصے میں وہ بہار اردو اکادمی کے سمینار میں شرکت کرنے آئے تھے اور مسز کرشنا پال بھی ان کے ساتھ تھیں۔ میں نے کئی مہمانوں کے ساتھ جوگندر پال کو بھی اپنی رہائش گاہ پہ بلایا تھا اور بہت دیر تک ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ جوگندر پال جسے چاہتے، اسے ٹوٹ کر چاہتے تھے، ان کی شخصیت میں نفاق اور نفرت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ان کی شخصیت صوفیت کی علمبردار تھی، ویسا نرم گو، خوش اخلاق اور مہمان نواز محبت کرنے والا فنکار میں نے آج تک نہیں دیکھا۔

جوگندر پال نے افسانے بھی لکھے اور ناول بھی۔ ان کے تقریباً ایک درجن افسانوی مجموعے اور سات عدد ناول منظر عام پر آئے جس کی تفصیلات ان کے گوشے میں کہیں نہ کہیں مل جائیں گی۔ ناول میں ''نادید'' بہت ہی مشہور ہوا کیوں کہ ان کے کردار اندھے تھے اور انہوں نے اندھے کردار کو خود جینے کی کوشش کی جس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ جوگندر پال اپنے ہر کردار کو خود جیتے تھے۔ اس کے درد کو محسوس کرتے تھے، تب ہی اسے سامنے لاتے تھے۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''مٹی کا ادراک''، ''بے محاورہ'' اور ''کھودو بابا کا مقبرہ'' بہت مشہور ہوا۔ جوگندر پال کے کرداروں میں سماج کے ہر طبقہ کی نمائندگی ہوتی ہے اور ان کے اندر ایک خاص ہمدردی کا جذبہ ضرور پایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو ان کے کرداروں میں جوگندر پال کی صوفی جیسی شخصیت بھی سما جاتی ہے جس کا احساس ہر ذی شعور قاری کو ہو سکتا ہے۔

جوگندر پال کے بعد اردو فکشن میں جو خلا محسوس ہو رہا ہے، اسے بھر پانا شاید آئندہ دنوں میں ممکن نہ ہو۔ جوگندر پال جیسی عظیم شخصیت کبھی کبھار ہی پیدا ہوتی ہے، لیکن اردو والوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ایسی شخصیت کی پزیرائی نہیں کر سکتے۔ یہ ایک کڑوا سچ ہے کہ اردو والوں نے جوگندر پال کی وہ پزیرائی نہیں کی، جو ان کا حصہ تھا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فن کار کبھی نہیں مرتا، اس کا فن آنے والی نسلوں کی امانت ہوتی ہے اور کبھی نہ کبھی اس کی پزیرائی ضرور ہوتی ہے۔ زیر نظر شمارے میں جوگندر پال کو خراج عقیدت کے پیش نظر ایک مختصر گوشہ ترتیب دیا گیا ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ ان پر مکمل نمبر بھی نکالا جائے۔

آخر میں ہم قارئین زبان وادب کو عید سعید کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ انہیں دنیا و آخرت کی کامرانی عطا فرمائے اور ان کا دامن خوشیوں سے بھر دے۔ آمین!

PDF Compressor Free Version

بیاد جوگندر پال

دیپک بدکی

A-102, S G Impression, Sector 4-B, Vasundhra,Ghaziabad 201012 (Mob: 09868271199)

جوگندر پال کے افسانے: مٹی کا ادراک کے حوالے سے

''بٹوارے کا نجیب وغلیق کہانی کار'' جوگندر پال، گزشتہ صدی کے مہاجر اردو افسانہ نگاروں میں بہت ہی اہم نام ہے جس نے ہجرت کا کرب، بے زمینی کا درد اور خانہ بدوشی کا غم، میلو ڈرامہ اور جذباتیت کے بغیر، بنا کسی غیظ وغضب اور اخلاقی تشدد آمیز رویے کے اپنے افسانوں اور ناولوں میں سمویا ہے۔ جوگندر پال کی تخلیقات جہاں ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں، وہیں افریقہ کی قبائلی زندگی، غربت اور نسلی استحصال کو بھی بے نقاب کرتی ہیں۔ بقول جوگندر پال:

''ایک زندہ کہانی کبھی ختم نہیں ہوتی، کتاب بھلے ہی ختم ہوجائے مگر قاری کے ذہن میں کہانی اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔''

جوگندر پال کی ولادت ۲۵ ستمبر ۱۹۲۵ء کو سیالکوٹ (پاکستان) میں ہوئی۔ مادری زبان پنجابی تھی، مگر ہائی سکول تک اردو ذریعہ تعلیم رہا۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرلی۔ تقسیم وطن کے سبب ۱۹۴۷ء میں انھیں ہجرت کرنا پڑی اور انبالہ میں اپنے کنبے کے ساتھ سکونت پذیر ہوئے۔ مفلوک الحال والد نے دودھ بیچنے کی چھوٹی سی دکان کھول لی جس کے لیے جوگندر پال علی الصباح پاس پڑوس کے گاؤں سے سائیکل پر بیسیوں کلومیٹر طے کرکے دودھ اکٹھا کر لیتے تھے۔

جوگندر پال کی حقیقی زندگی فکشن سے بھی زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں انھوں نے ایک کینیائی لڑکی سے شادی کرلی اور روزی روٹی کمانے کے لیے افریقہ چلے گئے۔ دوسرے ہی سال انھیں "ڈیوک آف گلوسیسٹر ہائی اسکول" نیروبی میں ملازمت مل گئی اور اس طرح وہ کینیا کی منسٹری آف ایجوکیشن کے ساتھ چودہ برس جڑے رہے۔ ۱۹۶۳ء میں والنٹری ریٹائرمنٹ لے کر واپس ہندستان کا رُخ کرلیا اور اسی سال پاکستان کا بھی سفر کرلیا جس کا بیان ان کے سفرنامے میں ملتا ہے۔

جوگندر پال نے ۱۹۶۴ء میں سرسوتی بھون پوسٹ گریجویٹ کالج، اورنگ آباد، مہاراشٹر میں بطور پروفیسر جوائن کرلیا اور ایک سال کے بعد ہی پرنسپل مقرر ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد ۱۹۷۸ء میں دہلی کو اپنا مستقر بنالیا اور پھر ادب کے ہوکر رہ گئے۔ انھوں نے کئی ملکوں جیسے برطانیہ، امریکہ، روس، پاکستان، ٹیونیسیا وغیرہ کا سفر کیا جب کہ قطر اور دوبا وغیرہ میں انھیں ادب پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا گیا۔ ۲۳/اپریل ۲۰۱۶ء کو ان کی روح قید جسد سے آزاد ہوگئی۔ ان کے لواحقین میں ان کی اہلیہ، دو بیٹے اور ایک بیٹی حال حیات ہیں۔

اظہار خیال کے لیے جوگندر پال نے اردو زبان کو چُن لیا اور بیس سے زائد کتابیں اور سیکڑوں افسانے و افسانچے قلم بند کرلیے جن کا انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ بقول جوگندر پال:

''اردو محض زبان نہیں بلکہ ثقافت کا آئینہ ہے۔''

ان کی پہلی کہانی ''تیاگ سے پہلے'' ۱۹۴۵ء میں شاہد احمد دہلوی کے رسالے ''ساقی'' میں شائع ہوئی۔ جوگندر پال نے تیرہ افسانوں کے مجموعے، تین افسانچوں کے مجموعے، تین ناول، تین ناولٹ اور دو انتقادی کتابیں رقم کی ہیں۔ ان کی تخلیقات کی فہرست یوں ہے: افسانے ''دھرتی کا کال'' (۱۹۶۱ء) ''میں کیوں سوچوں'' (۱۹۶۲ء) ''رسال'' (۱۹۶۸ء) ''مٹی کا ادراک'' (۱۹۷۰ء) ''لیکن'' (۱۹۷۷ء) ''بے محاورہ'' (۱۹۷۸ء) ''بے ارادہ'' (۱۹۸۱ء) ''جوگندر پال کے منتخب افسانے'' (۱۹۸۷ء اور پاکستان ۱۹۸۹ء) ''کھلا'' (۱۹۸۹ء) ''کھودو بابا کا مقبرہ'' (۱۹۹۴ء)

PDF Compressor Free Version

''جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب'' (۱۹۹۶ء) ''جوگندر پال کے شاہکار افسانے'' (۱۹۹۶ء) ''بستیاں'' (۲۰۰۰ء) افسانچے: ''سلوٹیں'' (۱۹۷۵ء) ''کتھا نگر'' (۱۹۸۶ء) ''پرندے'' (۱۹۹۱ء) ناول اور ناولٹ: ''ایک بوند لہو کی'' (۱۹۶۳ء، پاکستان ۱۹۶۴ء) ''آمد ورفت'' (ناولٹ ۱۹۷۵ء) ''بیانات'' (ناولٹ ۱۹۷۵ء) ''نادید'' (۱۹۸۷ء Blind) ''خواب رو'' (۱۹۹۰ء، پاکستان ۱۹۹۱ء Sleep Walkers) ''پار پرے'' (۲۰۰۴ء Black Waters) انتقادیات: ''رابطہ'' (۱۹۹۷ء) ''بے اصطلاح'' (۱۹۹۸ء)

افریقہ کی زندگی کو انھوں نے دقیقہ ریزی سے دیکھا، پرکھا اور سمجھا اور اس پر کئی دلسوز کہانیاں تحریر کیں جیسے ''معجزہ''، ''دھرتی کا کال''، ''پرش اور پشو'' وغیرہ۔ ماچاکوس میں نابیناؤں کے ایک گھر کو دیکھ کر وہ اتنے متاثر ہوئے کہ اس پر ایک پورا ناول ''نادید'' رقم کیا جو بہت مقبول ہوا۔ یہ ناول ایک ایسے گھر کی کہانی ہے جس میں سبھی نابینا ہیں، اس کے باوجود محبت، پیار، حسد اور رشک جیسے جذبات سے بے خبر نہیں۔ جوگندر پال کے افسانوں میں دردمندی اور ہم گزاری کا شدید احساس ملتا ہے۔ ان کے یہاں کچن میں بیٹھی تنہائی سے جوجھتی عورت اپنے چولہے، آٹے، برتنوں، نمک دانی اور دیگر اشیا سے ہم کلام ہوتی ہے اور تقسیم وطن کے بکھراؤ کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے۔

ناول ''خواب رو'' میں انھوں نے کراچی کے ایک لکھنوی مہاجر کا کرب بیان کیا ہے جو اپنی ثقافتی اساس لکھنؤ میں چھوڑ آتا ہے، مگر نہ تو وہاں کے گلی کوچوں اور چوک کو بھول پاتا ہے اور نہ ہی ملیح آباد کے آموں کی خوشبو کو۔ اس کے علاوہ جوگندر پال نے ہندستانی معاشرے کی بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں سے بھی پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے مثلاً ایک لاولد عورت پر اس کے مرد کا شک کرنا، ایک بے گھر لڑکے کا اپنے مستقبل کے لیے فکرمند ہونا، ایک بوڑھے کا شادی کے بہت عرصہ بعد حیرت انگیز انکشافات کرنا، ایک مقبرے کی حقیقی داستان بیان کرنا اور ایک متوسط کنبے کا ریل کے سفر کے دوران ریلوے افسر شاہی کے ہاتھوں ہراساں ہونا۔ خلا کا سفر، چاند کی تسخیر اور مریخ پر پہنچنے کی تیاری بھی ان کے چہیتے موضوعات ہیں۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ خلا کو انھوں نے بطور علامت پیش کیا ہے۔ اسی طرح جوگندر پال نے عصری عالمی مسائل، سرد جنگ، امریکہ روس کے باہمی تعلقات وغیرہ پر بھی افسانے لکھے ہیں۔ اورنگ آباد میں رہنے کے سبب انھیں ایلورا گپھاؤں کے ساتھ کافی لگاؤ ہوگیا اور اس حوالے سے بھی کئی افسانے تحریر کیے۔ اُدھر پنجاب میں ملی ٹینسی کے بارے میں انھوں نے ''آخری پاٹھ'' رقم کیا جس میں دہشت گرد گاؤں کے پردھان کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فرمان جاری کرتے ہیں کیوں کہ وہ لوگوں کو تشدد کا غلط راستہ ترک کرکے امن کا راستہ اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔

جوگندر پال کے افسانوں کا کینواس بہت بڑا ہے۔ ان کے کردار جاندار اور متحرک ہوتے ہیں اور ہمیشہ زندگی کی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ ایسے کہانی کار ہیں جو اپنی کہانی کے ماضی، حال اور مستقبل، تینوں سے واقف ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ افریقی زندگی پر اتنی ہی آسانی سے قلم اٹھاتے ہیں جتنی آسانی سے تقسیم وطن کی صعوبتوں پر۔ بقول افسانہ نگار وہ کہانی جیتے ہیں اور اس کا درد اپنے اندر سموتے ہیں۔ انھوں نے بیشتر افسانے پس آزادی لکھے جب ترقی پسند تحریک اپنے دور شباب کو پیچھے چھوڑ کر مدار تنزل میں داخل ہوچکی تھی۔ وہ اس تحریک کے ساتھ جڑے رہے، مگر اپنی شرطوں پر، ان کا طرز تحریر مخصوص ومنفرد تھا اور وہ علامتوں اور استعاروں کا استعمال کرتے رہے جو ان کو جدیدیت کے قریب لاتا رہا۔ اس بارے میں انھوں نے ایک انٹرویو (جون ۲۰۰۶ء) میں خالد سہیل کو یوں نصیحت دے ڈالی:

> ''تم ایک افسانہ نگار بھی ہو اور ایک ماہر نفسیات بھی ہو۔ تمہارا ماہر نفسیات ہونا تمہارے لکھاری ہونے کے لیے فائدہ مند ہوسکتا ہے اور نقصان دہ بھی۔ نقصان دہ اس وقت ہوگا جب تم کہانیوں میں کرداروں کی نفسیات سمجھانا شروع کردو گے۔ کہانی میں کچھ پراسراریت رہنی چاہیے جسے قاری خود حل کرے۔''

جوگندر پال کے یہاں اختصار ملتا ہے جو کسی ابہام وایہام کی گنجائش نہیں چھوڑتا، کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ کہنے سے زیادہ اَن کہا موثر ہوتا ہے۔ یہی

PDF Compressor Free Version

وجہ ہے کہ انھوں نے جاپانی ہائیکو کے تتبع میں افسانچے کی صنف کی ترویج میں کافی دلچسپی لی۔ انھوں نے اردو ادب کو کئی جاندار کردار دیے۔ خالد سہیل کے ساتھ ایک انٹرویو میں جوگندر پال فرماتے ہیں:

''میرے لیے کہانی لکھنا دھند میں گاڑی چلانے کی طرح ہے۔ قاری میرا مسافر میرے ساتھ چل رہا ہوتا ہے..... کہانی لکھنا اور پڑھنا دھیرے دھیرے انکشاف کا عمل ہے۔''

جوگندر پال کی کہانیاں ہمیں ایک طلسمی دنیا میں لے جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے مجموعے ''مٹی کا اِدراک'' کے فلیپ پر یہ عبارت درج ہے:

''شاید اسی لیے جو کوئی بھی ان کہانیوں کی دنیا میں داخل ہوتا ہے، وہ لوٹنا بھول جاتا ہے اور ایک افسانوی حقیقت کے ماحول میں کھو جاتا ہے۔''

اسی کتاب کے دیباچے میں فرماتے ہیں:

''میں نے آپ کو اپنی کہانیوں میں مخاطب کیا ہے اور مجھے جو کچھ کہنا ہے میں نے انھی کہانیوں میں کہہ دیا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ مصنف اپنے قارئین کے درمیان سج کر بیٹھ جاتا ہے اور بات بار بار یہاں آ کر رُک جاتی ہے 'اور کہیے.....؟' حالانکہ اس سے پیشتر کچھ بھی نہیں کہا گیا ہوتا ہے..... تو اس خفت سے بچنے کے لیے مجھے فوراً یہ کہنا ہے کہ مجھے آپ سے اس دیباچہ میں کچھ بھی نہیں کہنا ہے۔''

افسانوں کے مجموعے ''مٹی کا اِدراک'' میں تیرہ کہانیاں شامل ہیں۔ پہلی کہانی ''دومنٹ کی خاموشی'' میں راوی افریقہ کا ایک بدنما، مگر دولت مند صنعت کار ہوتا ہے جو اپنی بدصورت ملازمہ محبوبہ کرا کا کو نظر انداز کر کے ایک خوبصورت لڑکی سے شادی کرتا ہے جو اس کی دولت کے چرچے سن کر بنا دیکھے شادی کے لیے راضی ہو جاتی ہے، مگر پہلی ہی نظر میں اس سے شدید نفرت کرتی ہے اور اس کے مرنے کے لیے دعائیں کرتی رہتی ہے۔ راوی کی لاکھ کوششوں کے باوجود یہ نفرت کم نہیں ہوتی۔ بعد میں جب راوی کی موت واقع ہوتی ہے اور آفس کے ملازم اس کی یاد میں دومنٹ کی خاموشی اختیار کرتے ہیں تو راوی کی روح آ کر اس کارروائی کا نظارہ کرتی ہے۔ اسے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قتل رامانند کے ہاتھوں ہوا ہے جس پر وہ بڑا مہربان رہا تھا، مگر کس کی ایما پر یہ معلوم نہیں۔ وہ کبھی بیوی پر شک کرتا ہے اور کبھی ملازمہ کرا کا پر۔ ہال میں مرحوم کا ایک بت نصب کیا جاتا ہے، مگر اس سے بھی بدنمائی ظاہر ہوتی ہے۔ راوی کی روح ان دومنٹوں کے دوران ہر کسی کے ڈھونگ سے واقف ہو جاتی ہے۔ ادھر لوگ بت کے نیچے بھی ماتم مناتے ہیں جس میں مرحوم کی روح گھس جاتی ہے۔ جنرل منیجر کو مرحوم کی موت میں اپنی ترقی کا موقع دکھائی دیتا ہے، اس لیے راوی کی بیوی کو اپنا عطر بیز رومال پیش کرتا ہے حالانکہ اس نے ایک آنسو بھی نہیں بہایا ہوتا ہے۔ آخر کار اس روح کو کرا کا نظر آتی ہے جو بت کے پاؤں کے درمیان سچے آنسو بہا کر ہلکان ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ دیکھ کر روح کو تسلی ہوتی ہے اور وہ چین سے پرواز کرتی ہے۔ افسانے سے ایک اقتباس:

''مشرقی عورت بڑی شوہر پرست ہوتی ہے اور گرمی ہو یا سردی، وہ اپنے شوہر کی روح کو ہر دم ادنی لباس کے مانند پہنے رکھتی ہے۔''

افسانہ ''غروب'' میں ایک چالیس سالہ ناکتخدا سائنس داں پروفیسر ڈاکٹر پانڈے اس بات پر فکر مند ہے کہ سورج ڈھائی کروڑ سال کے بعد ٹھنڈا پڑ جائے گا اور زمین بے سہارا ہو کر ابدی تاریکی میں ڈوب جائے گی۔ پروفیسر قادر جو ادب پڑھاتا ہے، پروفیسر پانڈے کو اس احمقانہ فکر سے باہر نکالنے کے لیے سمجھاتا ہے کہ مستقبل، اور وہ بھی جو کروڑوں سال دور ہے، میں جینے کے بجائے حال میں جینا سیکھ لو۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ عورت خلا کی دیوانی نہیں ہوتی بلکہ خلا کو بھرا پرا دیکھنے کی متمنی ہوتی ہے جس کے لیے پیار و محبت درکار ہے۔ دراصل یہ اس کے تحت ''خلا'' کے موضوع پر تحقیق کر رہی ریسرچ اسکالر ستیہ ہر مزجی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ ان خدشوں کے باوجود ڈاکٹر پانڈے خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ:

''سورج کی آگ لازوال ہے۔ 'روح آتش' جو کبھی

PDF Compressor Free Version

بجھتی، کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی۔"

اور اس کی تائید مس ہرمزجی بھی کرتی ہے کیونکہ پارسیوں کا یہی عقیدہ ہے۔ پروفیسر قادر کے علاوہ اس کا چپراسی بھی مہمیز کرتا ہے:

"آدمی اِلم سے بڑا نہیں ہوتا۔ دل بڑا ہو تو آدمی بھی بڑا ہوتا ہے، میں اپنی لگائی کو سو حریفوں کی سبھا سے اٹھا کر بھگا لایا تھا سرکار، بس اندر کی ایک تپن سی، ایک چاہ سی تھی، سو...."

وہ یہ بھی تجویز کرتا ہے کہ طلبہ کو سائنس پڑھانے سے پہلے محبت کرنا سکھانا چاہیے۔ ڈاکٹر قادر اور پھر چپراسی کی بات سے مشتعل ہو کر ڈاکٹر پانڈے اپنی ریسرچ اسکالر پر ڈورے ڈالنے لگتا ہے۔ پروفیسر کی باتیں سن کر ہرمزجی اس بات کی جانب توجہ دلاتی ہے کہ وہ بیوہ ہے اور اس کارروائی کو اپنی ہتک سمجھتی ہے۔ پروفیسر پانڈے کو ایسا لگتا ہے جیسے ڈھائی کروڑ سال یکا یکی پورے ہو گئے، حالانکہ افسانہ نگار کہانی کا اختتام قاری کے ادراک پر چھوڑ دیتا ہے کہ آیا عاشق کی گرمی سورج کی طرح ماند پڑ گئی یا پھر پارسی عقیدے کے مطابق وہ لازوال ثابت ہوئی؟ افسانے کے دو اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

☆ "اس موت میں زندگی کا تسلسل نہیں ٹوٹتا، ہم جو زندہ رہ جاتے ہیں موت سے متعلق سوچ سوچ کر اس میں جان بھر دیتے ہیں، لیکن وہ موت ٹوٹل زندگی کی ٹوٹل موت ہے، گھور سیاہ بے بصری، یا نہ جانے کیا؟ کیونکہ بے بصری کا تصور بھی زندگی کا محتاج ہے۔"

☆ "محبت علم نہیں ڈاکٹر، محبت احساس ہے، کیونکہ علم سب کی ساجھی ملکیت ہے اور محبت سب کی اپنی اپنی۔ ڈاکٹر محبت ہر انسان سے براہ راست رابطہ پیدا کرتی ہے۔ تم نے اپنی لونگ اور لونگ کو بھی سائنٹفک سب ٹائٹلز دے رکھے ہیں، مگر محبت علم ہے نہ سائنس، محبت ایک تجربہ ہے، ایک ذاتی خوشی ہے، ذاتی غم ہے۔"

مجموعے کا تیسرا افسانہ "مٹی کا ادراک" ہے۔ یہ کہانی اجنتا کے کھنڈروں میں جیتے جاگتے مجسموں کی کہانی ہے جو زندگی کی حقیقت کو اپنے درون میں چھپائے ہوئے ہے۔ بہت عرصہ پہلے جب خود میں نے ان گپھاؤں کی سیر کی تھی اور مہاتما بدھ کے مجسمے کو دیکھا تھا، جو ایک طرف ہنستا تھا اور دوسری طرف سنجیدہ تھا تو مجھے بہت تعجب ہوا تھا اور میں نے اس پر ایک کہانی رقم کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر جوگندر پال کی کہانی "مٹی کا ادراک" پڑھ کر میرے منہ سے بے تحاشہ نکلا کہ "یہی تو میرے من میں بھی تھا۔" افسانے میں راوی اور اس کے دوست رام ناتھ (پارلیمنٹ ممبر) ایرانی، کیپٹن تیجا سنگھ وغیرہ اپنی بیویوں کے ہمراہ، گائیڈ مولوی صاحب کے ساتھ اجنتا کیوز (گپھائیں) دیکھنے کے لیے پہاڑیوں پر چڑھنے لگتے ہیں۔

یہ گپھائیں کسی انگریز نے شکار کرتے ہوئے اچانک دریافت کی تھیں۔ راستے میں گپ شپ کرتے ہوئے سبھی آگے بڑھ جاتے ہیں، مگر ہر ایک کا ردِعمل اس کے مزاج کے مطابق مختلف ہوتا ہے جیسے کسی کو دُکان کھولنے کی فکر ستاتی ہے، کسی کو ساڑیوں اور زیورات کے ڈیزائنوں میں زیادہ دلچسپی ہے یا پھر کسی کو بھابی جی کے ہاتھوں سے بنائے ہوئے گوشت میں زیادہ لطف آتا ہے۔ غار کا منظر بیان کرتے ہوئے راوی فرماتے ہیں:

"وہاں دیواروں پر، ستونوں پر، چھتوں پر ہر جگہ زندگی آباد تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ یہ صورتیں پتھروں کے باطن سے باہر نکل آئی تھیں اور ہمارے دیکھتے دیکھتے اب اپنی جگہ سے نکل کر ہمارے ساتھ آ کھڑی ہوں گی۔"

بقول گائیڈ یہ مورتیاں اسی مٹی سے بنی ہوئی ہیں جس سے ہم سب بنے ہوئے ہیں اور زندہ معلوم ہوتی ہیں۔ جس مہاتما بدھ کی مورتی کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے اس کے بارے میں ذکر ہے کہ:

"یوں معلوم ہو رہا تھا کہ مہاتما بدھ ابھی مسکراتا ہوا خوابناک فکرمندی کی کیفیت سے باہر آ کر اپنی آنکھیں کھول لے گا..... اور اب لگ رہا تھا کہ مہاتما بدھ اپنے جسم میں نہیں ہے اور چونکہ وہ ابھی ابھی جسم کے اندر ہی تھا، اس لیے کچھ ایسی کیفیت ہے گویا ابھی ابھی بتی گل

PDF Compressor Free Version

ہوئی ہو، اندھیرا گویا روشنی کا سایہ بن کر نظر آرہا ہو، صرف ایک لمحے کے لیے، لیکن یہ لمحہ ابدی ہوگیا ہے۔"

غار میں ایک اور نسوانی تصویر ہے جس کو آپ جہاں سے دیکھیں گے، اس کی آنکھیں آپ کا تعاقب کرتی نظر آئیں گی۔ گائیڈ کو ان تصویروں کے خالق کے بارے میں کوئی علم نہیں، بقول اس کے:

"اجنتا کی یہ تصویریں اپنے بالغ شعور کا ظہور ہیں اور انھیں دیکھ کر ان کے خالق کا خیال نہیں آتا بلکہ خود انھی کے خیال سے دل ودماغ معمور ہوجاتے ہیں۔"

آخر میں گائیڈ انھیں مہاتما بدھ کے دیوقامت بت کے سامنے کھڑا کرتا ہے اور انھیں احساس ہوتا ہے کہ پتھر میں زندگی متحرک ہے، کبھی وہ مسکراتا ہے، کبھی فکرمند ہوتا ہے، کبھی آنکھوں سے نرم نرم روشنی پھوٹتی ہے اور وہ خود مجسمے ہیں جب کہ مجسمہ زندہ انسان ہے جو ہمیں دیکھ رہا ہے۔ افسانے میں سے چند اہم اقتباسات:

☆ "یہ کوئی دھوکا نہیں جو یہ مٹی کی مورتیں زندہ معلوم ہوتی ہیں، ہم بھی مٹی کی مورتیں ہیں۔ ہماری زمین کی ساری زندگی ہی مٹی سے بنتی ہے..."

☆ "زندگی کی ساری داستان مٹی سے ہی عبارت ہے، یہیں زندگی کا سارا سرمایہ دفن ہے۔ مٹی ہی زندگی کی ماں ہے اور اسی کے بطن سے سارے پیکر برآمد ہوتے ہیں، ہمارے، جانوروں کے، کیڑے مکوڑوں کے، سب کے۔ مٹی سراپا زندگی ہے اور اپنے سکوت، بہرہ پن اور بے حرکتی کے باوجود بولتی، ہنستی اور ہلتی ہے۔"

☆ ہر ذرّے کا اصل مقام یہی خاک ہے، انھی دیو قامت چٹانوں میں مخلوق کی ہڈیاں رچی ہوئی ہیں۔"

☆ زندہ تصویر کا کوئی خالق نہیں ہوتا، وہ اپنے ہی جراثیم سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی رگوں میں اپنا خون دوڑتا ہے۔"

افسانہ "کلک" ایک ڈاکو کالے سنگھ کے پیار اور تیاگ کی کہانی ہے جس میں مہم پر جانے سے قبل اس کے ساتھی جرنیل سنگھ کی بائیں آنکھ پھڑکتی ہے اور وہ سردار کو روکنے کی ناکام کوشش کرتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ کالے سنگھ اپنی محبوبہ لیکھاں کے گاؤں جاتے وقت ہمیشہ اکیلے چلا جاتا ہے۔ کرپان کا دھنی سردار پستول بھی ساتھ رکھتا ہے کہ نہ جانے کب گولیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اسے یہ احساس ہے کہ لوہے کے بدن کے اندر کومل اور کچی رگیں ہیں جو اگر چھد جائیں تو موت واقع ہوسکتی ہے۔ اُدھر لیکھاں کی منشا ہے کہ اس کا بیٹا ڈاکو کا بیٹا نہ کہلائے، اس لیے وہ کالے سنگھ سے ڈاکہ زنی چھوڑنے اور باضابطہ شادی کرنے پر اصرار کرتی ہے، لیکن وہ ہر بار ہنسی میں ٹال دیتا ہے۔ اس بار پولیس پھر اس پر گولیوں کی بوچھار کرکے نرغے میں ڈالتی ہے اور وہ پکڑا جاتا ہے۔ پولیس کی حیرانی کی انتہا اس وقت نظر آتی ہے جب کالے سنگھ ایسا نامی ڈاکو بڑی آسانی سے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور جیل جانے کے لیے تیار ہوجاتا ہے مگر انھیں کیا معلوم کہ وہ لیکھاں کا سہاگ اتنی جلدی اجاڑنا نہیں چاہتا۔

"سراپا" ایک مصور لطیف کی کہانی ہے جو اپنے ماڈل ساحرہ کی مکمل اور لافانی تصویر بنانا چاہتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ خود اس کے وجود کا حصہ بن جاتا ہے۔ مصور کو یہ احساس ہوجاتا ہے کہ خدا، جو حقیقی خالق ہے، مخلوقات الارض کو بنا کر خود پردہ پوش ہے اور یہی بڑے فن کار کی نشانی ہے۔ لطیف کی یہ کوشش ہے کہ وہ اپنی محبوبہ ساحرہ کے شباب کے فانی لمحات کو کینوس پر قید کرکے امر کردے۔ اس کے برعکس ساحرہ اسے حسن کا نظارہ کرنے کی دعوت دیتی ہے، مگر وہ اپنی دھن میں مست رہتا ہے۔ مصور کا ماننا ہے کہ جامد اشیا کے مقابلے میں متحرک اشیا کو کینوس پر اتارنا بہتر ہے، تاکہ ان کے زود گزر لمحات جاوداں ہوسکیں۔ البتہ تصویر میں مصور کو اپنے تصور کی ساحرہ نظر نہیں آتی، حالانکہ اسے یقین ہے کہ تصویر مکمل ہونے پر دونوں یعنی ماڈل اور تصویر ایک ہوکر رہ جائیں گی، اس لیے وہ تصویر کو متحرک بنانے میں ہر دم کوشش کرتا ہے۔ آخر کار مصور اور ماڈل، دونوں کے جسموں اور روحوں کا باہمی ملاپ ہوتا ہے اور مصور کو ساحرہ کے وجود کا مکمل احساس ہوتا ہے۔ افسانے سے ایک اقتباس:

"فن لطیف کسی شکایت کے اظہار کا متحمل نہیں ہوتا، بلکہ

PDF Compressor Free Version

فنکار کی سپردگی سے وجود پذیر ہوتا ہے۔"

افسانہ "بیج" وجودی کشمکش کی کہانی ہے جس میں ایک انسان اپنی بدلتی ہوئی ہیئتوں میں اصل کی تلاش کرتا ہے اور زندگی اور موت کی حقیقت جاننا چاہتا ہے۔ راوی کو اس بات کا تعجب ہے کہ گھر گھر میں شری رام کی جو تصویریں لگی ہیں وہ سب ایک دوسرے سے مختلف کیوں ہیں؟ شاید اس لیے کہ وہ مصور کی تصوراتی شبیہ ہوتی ہیں، پھر اصل شری رام کون ہے؟ راوی کو لگتا ہے کہ دراصل وہ خود ہی شری رام کا روپ ہے اور ابدیت پانے کے لیے اسے بقول کرشن اپنے رشتے ناتوں سے واسطہ توڑنا پڑے گا۔ اسے اپنی روح کی گمشدگی کا بھی احساس ہے کہ وہ تب گم ہو گیا تھا جب اس کی پیدائش ہوئی تھی، پھر کمسنی میں کنبھ کے میلے میں دوبارہ کھو گیا تھا اور ایک عمر رسیدہ امریکی سائنسدان و محقق، جو بعد میں سوامی کلف بابا بن گیا، کی شرن میں چلا گیا اور عربی، سنسکرت اور انگریزی سیکھ لی۔ بابا امریکہ سے ہندستان اس لیے آیا کہ بھگوان نے پشو اور پرش کو ٹانگیں دی ہیں اور پیپل کے پیڑ کی طرح جکڑ کر نہیں رکھا۔ اسے فطرت کے رازوں کو سمجھنے کے لیے سائنس ناکافی لگتی تھی۔ اِدھر راوی کا تجسس اسے کئی سوال کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ سادھو کون ہے، اس نے کھوئے ہوئے راوی کو کیوں اٹھا کر اپنا لیا، پولیس میں دینے کے بدلے کیوں پال لیا اور وہ اس کے توسل سے کیا پانا چاہتا ہے؟ بابا کلف نے مر کر اپنی ذات میں وہ شے پائی جو امر ہے، مگر اس کی موت کے بعد راوی خود اپنی تلاش میں دیس بدیس گھومتا رہتا ہے یہاں تک کہ بابا کلف کی نئی دنیا میں بھی پہنچ جاتا ہے۔ نئی دنیا میں اس کے سوال "میں کہاں ہوں؟" کے جواب میں ایک منچلا مذاقاً کہتا ہے "یہاں میرے پاس۔" مگر یہی مذاق بازگشت کی طرح ہر جگہ اس کا پیچھا کرتا رہتا ہے اور پھر راوی خود بھی اس نقطۂ اتصال پر پہنچ جاتا ہے جہاں عرفان کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کا ماضی اس پر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ پیدائش سے پہلے کون اور کیا تھا، وہ پیدا ہو کر کھویا نہیں تھا اور نہ اب کھو رہا ہے بلکہ گم شدہ بچے کی مانند اپنی ماں سے آملا ہے۔ اس کی ذات انسان کی اصل ذات میں مدغم ہو رہی ہے۔ افسانے سے ایک اقتباس:

"آدمی خود کو لاکھ دانا کہے، بے چارے کے علم کی کل بساط یہی ایک سے دس تک ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ایک سے دس تک دہراتا ہے۔"

"بازار" کہانی ہے غربت، تضحیک اور بے روزگاری کی، جس میں ایک آجر اپنے ملازم چندر بھان کی، اس کے رفیق کار مس آپٹے کے سامنے بے عزتی کرتا ہے اور ملازم بے روزگاری کے خوف سے اپنا سارا احتجاج اور غصہ پی جاتا ہے، پھر بھی انا کی تسکین کے لیے وہ گھر جا کر اپنی بیوی کے سامنے ڈینگ مارتا ہے کہ اس نے ناموس کی خاطر اپنے آقا کو کھری کھری سنا دی۔ اپنے شوہر کی شخصیت سے واقف بیوی اس کی باتوں پر وشواس نہیں کرتی اور اَن سنی کر کے بازار سے ایک پاؤ گھی لانے کو کہتی ہے۔ ساتھ ہی وہ بول اٹھتی ہے:

"سنوں کیا؟ کوئی بھولی بھالی گھریلو عورت ہوتی تو تمہاری باتیں سچی مان لیتی، پر میں بھی بازار میں بیٹھتی ہوں۔"

افسانہ "ٹیلی سکوپ" ہمالیہ کی اونچائیوں پر تعینات ایک چینتیس سالہ سرکاری نیوی گیٹر موھنی کے گرد گھومتا ہے جو پڑوسی ملک کے فوجی پیغامات کو وائرلیس پر پکڑ کر ہیڈ کوارٹر کو بھیجتی رہتی ہے۔ ایک روز موھنی کو ٹیلیفون پر کوئی پیار بھری سحر انگیز آواز کانوں میں پڑتی ہے جو شام کو دوبارہ سنائی دیتی ہے جیسے وہ اسی کی منتظر ہو۔ پہاڑی نوکرانی تانگ سی موھنی کو بتاتی ہے کہ وہ بھی بہت مدت پہلے ایسی ہی آواز سے محبت کر بیٹھی تھی، مگر بعد میں ہمیشہ کے لیے چپ ہو گئی۔ تانگ سی نے اس رسم کا ذکر کیا جس میں گاؤں کے نوجوان ایک دوسرے کی آواز سن کر بغیر دیکھے بھالے ایک دوسرے سے محبت اور شادی کرتے ہیں اور بھگوان بدھ خود انھیں آشرواد دینے آتے ہیں۔ اپنی بدقسمتی کے بارے میں وہ کہتی ہے کہ:

"بیٹی، سارے سنسار کا دُکھ سکھ بانٹنے والا اگر ایک ہی منش پر اپنا سارا سکھ لگا دے تو دوسروں کا کیا بنے؟"

چنانچہ تانگ سی کے کنبے والوں نے اس آواز کو پہچان لیا اور دشمن کی آواز ہونے کے سبب شادی کرنے سے منع کیا، مگر تانگ سی نے من ہی من میں اس سے بیاہ رچایا تھا، اس لیے عمر بھر کنواری رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ سن کر موھنی کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ آواز بھی کسی دشمن کی ہی نہ ہو؟ پھر بھی اسے لگتا ہے کہ وہ اس آواز کے پیکر سے پیدائش سے پہلے ہی مانوس

PDF Compressor Free Version

ہو چکی ہے، اس لیے اس کی منتظر ہے۔ اپنے پیار کے اقرار کے ساتھ ہی اس کے کانوں میں برات کی شہنائیاں گونج اٹھتی ہیں، لیکن اس درمیان وہی آواز اسے خبردار کرتی ہے کہ دشمن نے آپ کی چوکیوں پر حملہ کر دیا ہے۔ موھنی کی آنکھیں آبدیدہ ہو جاتی ہیں اور اس کے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ کاش کوئی ایسا ٹیلی سکوپ ہوتا جو اس کے دل کی گہرائیوں کا حال سمجھ سکتا اور اس کے محبوب کو اس کی خبر پہنچا دیتا۔

افسانہ ''پرش اور پشو'' کینیا کے قبائل کی اوہام پرستی کی طویل داستان ہے جس میں غربت اور قحط کی وجہ سے ایک افریقی سیاہ فام قبیلے کو پانی کی تلاش میں در بدر بھٹکنا پڑتا ہے اور آخر کار یورپی لوگوں (وزونگو) کے یہاں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، مگر وزونگو انھیں چور، لٹیرے سمجھ کر ان سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ اس افسانے میں افریقی طور طریق اور رہن سہن کی بہت عمدگی سے عکاسی کی گئی ہے۔ سوکھے سے تنگ آ کر قبیلے کا ایک آدمی کنگوری خواب دیکھتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ اس نے قبیلے کے معبود ''گائی'' کو دیکھا ہے اور اس کا حکم ہے کہ انھیں اپنی دھرتی چھوڑ کر کوئی نئی جگہ تلاشنی ہوگی۔ اس کی باتوں سے متاثر ہو کر لوگ وہ علاقہ چھوڑتے ہیں اور تاریک جنگلوں میں نئی جگہ ڈھونڈنے نکلتے ہیں جہاں پانی دستیاب ہو، مگر ناکام رہتے ہیں۔ آخر کار کنگوری دوبارہ اعلان کرتا ہے کہ ''گائی'' پھر سے خواب میں آیا اور اس نے حکم دیا ہے کہ ہمیں چاہیے کہ یورپی زمینداروں کے یہاں کام کریں۔ اس حکم کی تکمیل میں وہ وزونگوں کے کھیتوں کی طرف جاتے ہیں مگر گورے ان کو چور اچکے سمجھ کر ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں جب تک قبیلے کے بزرگ ان کو سلام کر کے انھیں اپنی محکومی کا یقین نہیں دلاتے۔

اگلے افسانے ''کٹ'' میں زندگی کی حقیقت اور اداکاری میں فرق بتلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دراصل زندگی میں انسان کو خوشیوں اور جھگڑوں سے جو جھنا پڑتا ہے اور اب تو رشتوں میں بورڈم (کھٹاس) آنے لگا ہے جو گزشتہ پیڑھیوں میں نظر نہیں آتا تھا کیونکہ اب فریقین کی سوچ میں آزادی کا عنصر غالب ہو چکا ہے اور ایک دوسرے پر انحصار کم ہوتا جا رہا ہے۔ اداکاری میں اداکار صرف اپنا پارٹ ادا نہیں کرتا بلکہ اس کی روح اس کردار میں سما جاتی ہے، آرٹ زندگی بن جاتی ہے اور زندگی محض آرٹ بن جاتی ہے۔ ستیش اور سبیتا ایک دوسرے سے ازدواج میں بندھ کر کبھی لڑائی جھگڑا نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں جو ناممکن ہے اور اس کا احساس انھیں تب ہوتا ہے جب ان کے کانوں میں آواز آتی ہے کہ:

''ایکٹنگ مت کرو بابا، لونگ کرو!''

مجموعے کا حاصل افسانہ ''شرادھ'' ہے جو بھوک کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک شاہکار افسانہ ہے۔ افسانے میں ہندو معاشرے کی مردہ پرستی، روایات، اعتقادات اور اوہام پرستی کا بڑی دقیقہ ریزی سے جائزہ لیا گیا ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ مردوں کے بدلے زندہ مفلس اور حاجت مند لوگوں کی امداد کرے۔ انسانیت کی معراج اسی میں ہے کہ ہم کسی بھوکے بچے کے آنکھوں سے آنسو مٹا سکیں۔ افسانے میں ایک قلیل پنشن پانے والا سرکاری بابو جی ہے جس کی بیوی مذہبی اور جذباتی ہے اور اپنی ساس سسر اور مرحوم بیٹی ککلی کے شرادھ میں وہ سب چیزیں دان میں دینے کی خواہاں ہے جو مرحومین کو پسند تھیں۔ ککلی کی موت بچپن میں بیماری کے سبب ہوئی تھی کیونکہ ڈاکٹر کی صلاح کے باوجود والدین نہ تو اس کو پہاڑوں پر لے جا سکے اور نہ ہی اس کو روزانہ انگور کا رس پلا سکے۔ باپ کو کریلے پسند تھے اور ماں کو ماش کی دال، اس لیے دونوں اپنی اپنی جیبیں ٹٹول کر کچھ پیسے جمع کرتے ہیں اور بیٹے کو بازار سے انگور خریدنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ واپس آتے وقت بیٹا ایک بوڑھے اور بڑھیا کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھتا ہے جن کے بیچ میں ککلی جیسی صورت والی، ایک پیلی رنگت کی فاقہ زدہ لڑکی بیٹھی ہے۔ اسے لگتا ہے کہ شاید اس کے دادا، دادی اور بہن واپس زمین پر آئے ہیں اور بھوکے پیاسے ہیں، اس لیے وہ انگور اس لڑکی کو دے دیتا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

☆ ''یہ سب پاکھنڈ ہے۔ اپنی موت کے بعد ہم یکسر مر جاتے ہیں۔ ہماری سب خواہشیں مر جاتی ہیں۔ ہماری بھوک مر جاتی ہے۔ اگر موت مکمل موت نہ ہو تو ہم اسے موت کیوں کہیں؟ کتنا بہن کا روگ کیوں نہ کہیں، جس سے زندگی پر بھی موت کا گمان ہونے لگتا ہے۔''

PDF Compressor Free Version

☆ ''یہ لوگ... ہم سب لوگ مر چکے ہیں.... ہم..... ہم نہیں، بلکہ اپنے باپ دادا کی بھوکی روحیں ہیں، روٹی کی بھوک، ہنسی کی بھوک، شادی اور ساتھی کی بھوک، ہماری تہذیب کی طرح بڑی پرانی ہے۔ شرادھ کی رسم کی طرح بڑی پراچین۔ شرادھ ہمارے دیش کی بھوک کا ہی ایک تہوار ہے اور یہ تہوار اسی لیے شروع کیا گیا تھا کہ ہم غریب لوگ اپنی موت کے بعد بھی بھوکے بھوکے رہتے ہیں۔''

افسانہ ''مہابھارت'' میں دروپدی کو ایک عام عورت کا علامیہ بنا کر اٹھارہ ادھیائے میں اس کے مصائب اور زندگی گزارنے کے طور طریق بیان کیے گئے ہیں کہ ہمارے تہذیب یافتہ سماج میں ایک بیوہ کو بال بچے پالنے کی خاطر جسم فروشی پر اتر آنا پڑتا ہے اور سماج کی طرف سے اس کو کوئی تحفظ (social security) نہیں ملتا۔ مہابھارت پڑھتے ہوئے اسے اپنی زندگی یاد آتی ہے کیونکہ اس کی راتیں پردے میں گناہ کرتے ہوئے گزر جاتی ہیں اور اس کی زندگی میں کسی بھگوان کرشن کے آنے کی امید نہیں ہوتی۔ چنانچہ افسانہ نگار لکھتے ہیں کہ:

''اگر اسے ایک بھگوان مل جاتا تو وہ بھی کسی سہاگن کی طرح جیون کا رن جیت لیتی۔''

دروپدی کو ہر مرد جو اس سے محبت کا اظہار کرتا ہے، ہوس کا پجاری نظر آتا ہے۔ چنانچہ کہتی ہے:

''محبت اور شادی کی باتیں صرف کنواریوں کا جی بہلانے کے لیے کی جاتی ہیں۔ رنڈی پر ایسی باتوں کا کیا اثر ہوگا۔''

اس دوران محلے والوں کو پتہ چلتا ہے کہ وہ پیشہ کرتی ہے حالانکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بے سہارا عورت بے کار کیسے رہ سکتی ہے؟ لوگ اس کے خلاف ہو جاتے ہیں اور اسے لگتا ہے کہ ساری دنیا اس کا چیر اتارنے لگی ہے اور کوئی اس کو بچانے کے لیے آگے نہیں بڑھتا۔ وہ مایوس ہو کر سوچتی ہے کہ وہ اکیلی اپنی آبرو کی یہ مہابھارت کیسے جیت سکتی ہے؟

آخری افسانہ ''خلاباز'' میں ایک عورت مس مدھو ہواباز بننا چاہتی ہے، مگر زینہ عصبی سماج اس کے راستے میں اڑنگے لگاتا ہے، انٹرویو میں قہقہے لگائے جاتے ہیں اور مرد اس کو اپنے ہم پلہ نہیں سمجھتے۔ پھر بھی وہ خوابوں کی دنیا میں اڑانیں بھرتی ہے، دنیا بھر میں دوست بناتی ہے اور ان سے فلرٹ کرتی ہے۔ لندن میں سیدھے سادے پاکستانی دوست الطاف سے پاکیزہ رشتہ رکھ کر دیو کنیا بن جاتی ہے اور نیویارک میں وکی سے گھل مل کر راج کنیا بن جاتی ہے۔ اس کو اپنے دوست فانیسکا، شولو، وکی، رمی، راوڈی، کنول اور الطاف ایک دوسرے کا بدلا ہوا چہرہ نظر آتے ہیں۔ نیک، بھولے، معصوم، مکار! اور پھر ایک دن جب وہ ورکنگ ویمنز ہوسٹل میں قیام پذیر ہوتی ہے تو ایک خط ملتا ہے جس کے ذریعے اسے مطلع کیا جاتا ہے کہ پائیلٹ ٹریننگ کورس کے لیے اس کی درخواست نامنظور کی گئی ہے اور اس طرح اس کے خواب ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔

جوگندر پال کے افسانوں میں جیسا کہ ظاہر ہے انسانی زندگی کی مختلف تصویریں دقیقہ شناسی سے پیش کی گئی ہیں۔ ان کے موضوعات کی بوقلمونی انھیں خود کو دہرانے سے باز رکھتی ہے۔ ان کے یہاں زیادہ تر افریقہ، پاکستان اور ہندستان کا ماحول ملتا ہے جس میں ان کے کردار جیتے ہیں، جدوجہد کرتے ہیں اور اپنے وجود کو کھنگالتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کا جو عموماً نچلے اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، بڑی عرق ریزی سے تجزیہ کرتے ہیں اور ان کی پیش کش میں کوئی کوتاہی نہیں برتتے۔ جوگندر پال کو سائنس سے کچھ بیر سا نظر آتا ہے، چنانچہ ان کا ماننا ہے کہ حقیقت سائنس کی گرفت سے باہر ہے۔ یہ فلسفہ اکثر وہ لوگ اپناتے ہیں جو غیر سائنسی فلسفے کے زیر اثر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کئی افسانوں میں کائنات کی بناوٹ، انسانی وجود کی حقیقت اور زیست و موت پر بحث چھڑ جاتی ہے جو کبھی کبھی ایسے افسانوں کو بوجھل بناتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جا بجا علامتیں اور استعارے ملتے ہیں۔ وہ اختصار کو افسانے کی جان سمجھتے ہیں اور حشو و زائد سے پرہیز کرتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں جوگندر پال کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

بدنام نظر

Vill. Kunda, Sheikhpura 811105 (Mob. 9661147635)

صوفی صفت افسانہ نگار: جوگندر پال

۲۰۱۶ء اردو ادب کے لئے جیسے قیامت لے کر آیا ہو۔ انتظار حسین، عابد سہیل، ندا فاضلی، زبیر رضوی، محی الدین نواب اور اب جوگیندر پال یکے بعد دیگرے سب چلے جا رہے ہیں۔ یقیناً ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس کے لئے یہ کہا جا سکے کہ وقت سے پہلے چلا گیا۔ سبھی زندگی کی ایسی ڈھلان پر تھے کہ پھسلنا عین فطری تھا، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ یہ تمام لوگ اردو کے ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی اموات نے جیسے اردو ادب کی پوری عمارت کو ہلا کر رکھ دیا ہو۔ زلزلہ..... زلزلہ..... زلزلہ.....

جوگیندر پال صاحب سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۷۷ء یا ۱۹۷۸ء میں دریا گنج دہلی کے آگرہ ہوٹل میں کمار پاشی، مخمور سعیدی اور قمر احسن کے ساتھ ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی سی نشست تھی، جس میں ہم شریک تھے۔ اسی نشست میں پال صاحب نے اپنا ایک افسانہ ''کتھا ایک پیپل کی'' سنایا تھا۔ افسانہ کے ختم ہونے کے بعد بھی جیسے اس کے کردار ہمارے ساتھ ہو گئے ہوں، دیر تک خاموشی طاری رہی، بالآخر قمر احسن نے یہ کہتے ہوئے خاموشی توڑی کہ اب اس کے بعد کسی کا کچھ سنانا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ یوں نشست کا اختتام ہوا اور میرا یہ حال ہوا کہ تب سے آج تک میں جب بھی پیپل کے کسی گھنے پیڑ کو دیکھتا ہوں وہ افسانہ میرے اندر زندہ ہونے لگتا ہے۔ اس پر رہنے والا پر پھیلاتا پرندہ براہمنی اور وہ تمام زہریلے کیڑے جو پیڑ کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرتے ہیں، زمین کے اندر گہری جاتی پیڑ کی جڑیں، زمین کی گرفت سے پیڑ کی آزادی کی خواہش اور نہ جانے کتنا کچھ۔

میں نے اور قمر احسن نے رات بھر اسی افسانے پر بحث کی اسے مختلف ادبی خانوں میں رکھنے کی کوشش کی، لیکن ہر خانہ چھوٹا پڑ گیا۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ بغیر کسی رنگ کے چشمے سے اگر دیکھا جائے تو یہ ایک عظیم افسانہ ہے۔ اس دن سے آج تک معمولی کرتا پائجامہ میں ملبوس معمولی افسانہ نگار میری نگاہ میں غیر معمولی بنتا رہا۔ میں پال صاحب سے دوبارہ ملنا چاہتا تھا، ان سے ڈھیر سارے افسانے سننا چاہتا تھا، لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا چونکہ ان کا قیام کہاں تھا، مجھے اس بات کا علم نہیں تھا دوسرے مجھے اگلے دن واپس اپنے گھر جانا تھا، مگر اس کے بعد یہ ہوا کہ کسی بھی بک اسٹال پر مجھے ایسا کوئی پرچہ نظر آتا جس میں ان کی کہانی ہوتی تو میں ضرور خرید لیتا۔ ان کی کہانی پڑھتا، بار بار پڑھتا اور اس میں کھو جاتا۔

دھیرے دھیرے میں نے فون اور خطوط کے ذریعہ ان سے راہ و رسم بڑھالی اور ان کے قریب آتا گیا۔ مجھے یہ پتہ نہیں کہ وہ بھی مجھے اپنے قریب رکھتے تھے یا نہیں؟ لیکن یہ ضرور ہوا کہ اب ان کی ہر کتاب مجھے مل جانے لگی۔ کبھی ان کے دستخط کے ساتھ اور کبھی بغیر دستخط کے ''بے محاورہ''، ''کھلا''، ''کھودو بابا کا مقبرہ''، ''بستیاں''، ''کتھا نگر''، ''پرندے''، ''خواب رو'' اور پتہ نہیں افسانوں کے کتنے دوسرے مجموعے، ناولٹ اور ناول۔ اس طرح میں نے ان کی پچاسوں کہانیاں پڑھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ناقدین کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے یا کیا رائے ہوگی؟ لیکن معمولی قاری کی حیثیت سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کہانیاں لکھتے نہیں تھے بلکہ کہانیاں خود ان کے پاس چل کر آتی تھیں کہ مجھے لکھو۔ پھر وہ ان کہانیوں کے اندر اُترتے یا کہانیاں ان کے اندر اُترتیں دونوں آپس میں اس طرح گھل مل جاتے کہ انہیں الگ الگ پہچاننا مشکل ہو جاتا تب وہ لفظوں کا جامہ پہن کر قاری کے سامنے آجاتے۔ جب قاری ان الفاظ کو پڑھتا تو اس پر ایک ایسی سحر آگیں کیفیت طاری ہوتی کہ وہ خود بھی کہانی کا ایک حصہ بن جاتا اور اس کے لئے اس سحر سے نکلنا مشکل ہو جاتا اور اگر کہیں آپ نے بجائے پڑھنے کے خود پال صاحب کی

PDF Compressor Free Version

زبانی سن لی تو مجھے پتہ نہیں آپ اس کہانی کی گرفت سے کبھی آزاد بھی ہوسکیں گے یا نہیں، کہنا دشوار ہے۔

یوں تو ان کے تمام کے تمام افسانے بہرحال بہترین افسانوں کی صف میں رکھے جائیں گے، لیکن ان کے وہ افسانے جو تمثیلیت کے حامل ہیں، میرے خیال میں دوسرے افسانے خواہ کسی کے ہوں ان کے برابر نہیں رکھے جاسکتے۔ وہ جانوروں اور بے جا اشیا کو جس طرح کرداروں کا روپ عطا کرتے ہیں، ان کے مکالموں، حرکات اور اشارات سے جس طرح کا کام لیتے ہیں، ان کے ذریعہ زندگی کی پیچیدگیاں سلجھاتے ہیں، انسانی زندگی کے جس کرب کو سامنے لاتے ہیں، جس طرح ان کرداروں کو ہمارے بیچ لاکر کھڑا کردیتے ہیں، یہ کچھ وہی کرسکتے ہیں ''کتھا ایک پیپل کی''، ''پھول'' اور اس طرح کے کئی دوسرے افسانے اس کی واضح مثال ہیں۔

دوسری خوبی ان کے افسانوں کی یہ ہے کہ وہ دھیرے دھیرے آپ کو اپنے افسانوں میں شامل کرلیتے ہیں۔ اپنے کرداروں کے ساتھ دور تک آپ کو بہالے جاتے ہیں، پھر آپ یا تو خود بھی ان افسانوں کے کردار بن جاتے ہیں یا افسانوں کے کردار آپ کو اس طرح اپنی گرفت میں لیتے ہیں کہ آپ کے پاس اپنا کچھ نہیں بچتا، جو چیز بچتی ہے وہ ہے سچائی، ننگی سچائی جو آپ کو انسانیت کی زمین پر لاکر کھڑا کردیتی ہے اور آپ کے سینے میں ایک دردمند دل رکھ جاتی ہے۔

میرے خیال میں پال صاحب افسانے کے صوفی ہیں، فقیر ہیں، جو اپنے ساتھ ساتھ اپنے قاری کو بھی صوفیت اور فقیری سے قریب کردیتے ہیں، حالاں کہ ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کن بات کہنا اتنا آسان بھی نہیں ہے کہ ان کی شریک حیات مسز کرشنا پال جو ان کے ساتھ ہر وقت رہیں، نہ صرف یہ بلکہ اگر آپ قریب سے جانتے ہوں تو آپ کو پتہ ہوگا کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزم کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے:

''کہانی اور پال کی زندگی اب الگ الگ نہیں ہے۔
کہانی پال کی زندگی ہے اور پال کی زندگی ایک کہانی۔''

عاشق سچا عاشق، پال صاحب کہانیوں کے عاشق تھے۔ صوفی بھی تو عاشق ہی ہوتا ہے۔ ایک ایسا عاشق جو دنیا اور دنیاداری سے بے خبر صرف اپنے معشوق کے خیال میں گم، اس بات سے بالکل بے خبر کہ دنیا اسے کن نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ دیکھ رہی بھی ہے یا نہیں، لیکن صوفی کی صفت کی خوشبو دور دور تک ہوا کے ساتھ جاتی ہے۔ ایسا ہی پال صاحب کے ساتھ بھی ہوا۔ دور دور کے لوگ ان کی کہانیاں پڑھ کر ان کے مرید ہو رہے، کیوں کہ ان کی کہانیاں انسان کے اندر کی پریشانیوں اور پیچیدگیوں کی گرہیں کھول رہی تھیں۔ دشوار ہے یہ کہنا کہ کہانیاں ان کو بنتی تھیں یا وہ مختلف تانوں بانوں سے کہانیاں بنتے تھے۔ وہ تو مندا کنی کی طرح پاک صاف سورگ سے پربت پر اترتے، اچھلتے کودتے پھر گنگوتری سے زمین پر آدھمکتے اور ہگلی تک کبھی چیختے، چنگھاڑتے، کبھی خاموشی کے ساتھ چٹانوں کے چھوٹے چھوٹے کھردرے ٹکڑوں کو، Pebbles کو جاذب روپ دیتے ہوئے، کبھی کھیتوں کو سیراب کرتے ہوئے، کبھی بستیوں کو فکر کے سیلاب سے نہلاتے ہوئے چلتے جاتے تھے، بے خبر سب سے بے خبر تا وقتیکہ سمندر سے مل کر سکون نہیں پالیتے۔ لوگ دیکھ رہے تھے، ان سچائیوں کو جو وہ اپنے چاروں جانب اچھالتے جارہے تھے۔ لوگ پہچان رہے تھے ان کی انسان دوستی کو اس لئے وہ حاضر ہو رہے تھے ان کی خدمت میں انعامات واعزازات کے تحفے لے کر۔ ''میر تقی میر ایوارڈ''، ''ہندی، اردو ادب ایوارڈ''، ''غالب ایوارڈ''، ''مودی غالب ایوارڈ''، ''ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ''، ''پرویز شاہدی ایوارڈ''، ''بہادر شاہ ظفر ایوارڈ'' اور آخر میں ''بہار اردو اکادمی'' کا سب سے بڑا ایوارڈ افسوس کہ اسناد لینے کے لئے پال صاحب خود موجود نہیں رہے اور وہ سکریٹری بہار اردو اکادمی جناب مشتاق احمد نوری نے ان کی شریک حیات مسز کرشنا پال کے ہاتھوں میں دیا۔ پتہ نہیں اس وقت کرشنا بھابھی یا نوری صاحب کی ذہنی کیفیت کیا رہی ہوگی؟ میرا تو سوچ کر ہی دل بھر آتا ہے۔

اعزازات وانعامات کا یہ سلسلہ صرف ہندوستان ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ پاکستان اور دوحہ تک نے ان اہلیت کو تسلیم کیا اور ان کی خدمت میں انعامات واعزازات کا تحفہ بصد احترام پیش کیا، لیکن ان کے افسانے نہ سمجھ میں آئے تو ان کو جو ''گیان پیٹھ ایوارڈ'' دیتے ہیں، جو ''ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ'' جیب میں لے کر گھومتے ہیں، جو ''سرسوتی سمان''

PDF Compressor Free Version

عطا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ جوان اونچی کرسیوں پر براجمان ہیں وہ کور چشم تو ہیں ہی ان کا احساس سامعہ بھی مردہ ہے۔ اگر یہ ایوارڈ یا سمان پال صاحب کو ملتے تو پال صاحب کی عظمت میں کوئی اضافہ ہوتا کہ نہ ہوتا، ان اعزازات کی قدر و قیمت یقیناً بڑھ جاتی، جس طرح نوبل پرائز مہاتما گاندھی کو نہ ملنے سے ان کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑا، ہاں اگر وہ پرائز انہیں ملتا تو اس کی اہمیت میں ضرور چار چاند لگ جاتے۔

بہر حال! پال صاحب کے بارے میں میں نے لکھا کہ وہ صوفی صفت کہانی کار تھے، جنہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ کوئی ان کے بارے میں کیا رائے قائم کر رہا ہے۔ اگر آپ ان سے کبھی مل چکے ہیں تو بلاشبہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ ان کے سامنے بیٹھ کر آپ کبھی ان کی یا ان کی کہانیوں کی بڑائی نہیں کر سکتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ آپ کسی دوسرے افسانہ نگار یا شاعر کی برائی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تو آدمی کو اس کی تمام اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ اسے آدمی مانتے تھے۔ اگر کسی میں کوئی گندگی ہے تو وہ اس کا جواز پیدا کر کے اسے صاف ستھرا کرنے کے بعد آپ کے سامنے کھڑا کر دیں گے، لیکن شاید کچھ لوگ انہیں ایک گہرا افسانہ نگار ایک سچا انسان نہ سمجھ کر انہیں کوئی "شے" سمجھتے تھے۔ پال صاحب کے انتقال کے دوسرے دن میں کرشنا بھابھی کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ممبئی سے ماہنامہ "شاعر" کے ایڈیٹر جناب افتخار امام صدیقی کا فون آیا۔ اظہار تعزیت کے بعد انہوں نے کرشنا بھابھی سے پال صاحب کی تفصیل طلب کی۔ یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ جس پرچے نے پال صاحب کا خصوصی گوشہ نکالا ہو، وہ ان کی تفصیل ان کی غم زدہ شریک حیات سے ٹھیک دوسرے ہی دن طلب کر رہا ہو۔ اسی درمیان معلوم ہوا کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ دوسروں سے پال صاحب کے گھر کا فون نمبر دریافت کر رہے ہیں۔ ہم جو اردو کے قاری ہیں، شاعر ہیں، ادیب ہیں، ناقد ہیں، کتنا بے خبر ہیں اپنے آپ سے، نہ جانے یہ بے خبری ہمیں کہاں لے جائے گی؟

میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ پال صاحب سے میری مراسمت بڑھنے لگی۔ دھیرے دھیرے ہم میں اتنی قربت ہوگئی جیسے ہم ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ اب میں جب بھی دلی جاتا ان کے فلیٹ واقع گریٹر کیلاش پارٹ 2 میں ٹھہرتا، جب تک جی میں آتا رہتا۔ کبھی کبھی کرشنا بھابھی کے ساتھ سبزیاں اور دوسری اشیا لانے کے لئے بازار بھی چلا جاتا۔ سنیت پال (جوگندر پال کے صاحبزادے) انیتا سنیت پال کی بیگم اور بلراج کومل کی صاحبزادی) بھی گھر کے افراد کی طرح ملتے۔ سلطانہ (میری بیگم) رخسانہ (میری بیگم کی بہن) جمیل (میری بیگم کے بھائی) جب بھی دلی آتے پال صاحب کے ہی مہمان ہوتے۔ یشا النظر (میرے صاحبزادے) جب پہلی بار دلی، مقابلہ جاتی امتحان کے لئے گئے تو انہیں کے یہاں ٹھہرے اور جب تک ان کا ہاسٹل میں نظم نہیں ہو گیا انہیں کے یہاں رہے۔ یشا النظر کے بیان کے مطابق اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ وہ کہیں دوسری جگہ ہے۔ پال صاحب اور کرشنا بھابھی دو ایک بار میرے یہاں گیا کے مکان میں گئے، جہاں انہیں سلطانہ کی بنائی ہوئی باقر خانی اور رمنہ کا فلکٹ جسے وہ گجک کہتے تھے۔ بہت پسند آئے۔ حالیہ دنوں میں ہمارا ملنا ضرور کم ہو گیا تھا، لیکن خط اور موبائل کے ذریعہ رابطہ ہمیشہ قائم رہا۔

غالباً ۱۵ اپریل کو شوکت حیات نے فون پر مجھے بتایا کہ جوگندر پال صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے اور وہ کئی دنوں سے کوما میں ہیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا، میں دلی چلا آیا، لیکن کرشنا بھابھی نے بتایا کہ میں ان سے مل نہیں سکتا کیوں کہ وہ I.C.U میں Ventilatar پر ہیں، میری سمجھ میں آ گیا کہ الٹی گنتی شروع ہو گئی ہے، چونکہ دو سال پہلے میں اپنی بیگم سلطانہ کا حشر دیکھ چکا تھا۔ اس کے بعد نہ تو میں نے پال صاحب کے گھر کوئی فون کیا، نہ اسپتال گیا کیوں کہ I.C.U میں ملنے کی اجازت نہیں تھی، مگر میرا بیٹا ان کی پل پل کی خبر لے رہا تھا۔ جب میں نے ۲۳ اپریل کی شام کو اس سے پال صاحب کی خبر لینے کو کہا تو وہ روہانسا سا ہو گیا، اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے مردہ سی آواز میں مجھے بتایا کہ انکل کو مصنوعی زندگی اور مصنوعی سانس پسند نہیں تھی، اسی لئے وہ سب کو چھوڑ کر حقیقی زندگی کی تلاش میں نکل پڑے۔ وہ اب آپ کو کہانیاں نہیں سنا سکیں گے۔ بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

مجھے کرشنا بھابھی کو فون کرنا چاہئے تھا، نہیں کیا۔ مجھے سوکرنا سدھیر اور سنیت کو تسلی دینا چاہیے تھا، یہ بھی نہیں کیا۔ کوئی پیدا ہو تو رسمیں

PDF Compressor Free Version

نبھاؤ، شادی ہو تو رسمیں نبھاؤ، مرجانے پر بھی رسمیں نبھاؤ، میں تو خود ہی خالی ہو گیا تھا، سو رات بھر میں خود کو ہی تسلی دیتا رہا۔ وہ ''بے شناخت'' جس کی شناخت اس کے ہر افسانے کا کردار ہے، جس کی شناخت قاری کے دل و دماغ میں ہے۔ وہ جس کی شناخت رام بھی ہے راون بھی، مردہ بھی ہے زندہ بھی، پیڑ بھی ہے جانور بھی، جاندار بھی ہے بے جان بھی۔ وہ جس کا ہر کردار زندہ ہے تو کیا وہ ''بے شناخت'' ہمارے درمیان نہیں رہا؟ ایک سچائی جو بہت بڑی سچائی ہے، مگر دل بار بار یہ دعا کرتا کہ کاش یہ جھوٹ ہو۔

جیسے تیسے رات گزری، لیکن صبح ہونے کے بعد مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ بیٹے کو اٹھایا اور بائیک دوڑاتا ہوا منداکنی انکلیو پہنچ گیا۔ سب کچھ اپنی جگہ پہ تھا، ٹھیک ویسا کا ویسا جیسا میں نومبر ۲۰۱۵ء میں دیکھ کر گیا تھا۔ فلیٹ کا باہری حصہ، پال صاحب کے نام کی لگی تختی، نوادرات، کرشن جی کی پینٹنگ ساری چیزیں ویسی کی ویسی ہی تھیں۔ میں فلیٹ کے اندر داخل ہوا۔ کرشنا بھابھی اپنی مخصوص نشست پر ویسی کی ویسی صاف ستھری بیٹھی تھیں۔ میں ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور تب مجھے احساس ہوا کہ وہ پوری کہاں وہ تو وہاں پر آدھی ہی ہیں۔ نصف تو شاید پال صاحب کے ساتھ کینیا، دلی، اورنگ آباد و جامعہ ملیہ جانے کہاں کہاں گھوم رہی ہیں۔ نہیں وہ شاید اسپتال میں تھیں جہاں پال صاحب نے اپنی زندگی کو مشینوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا اور اٹھارہ دنوں تک ان کی زندگی مہابھارت کا یدھ لڑتی رہی۔ معلوم نہیں جیت کس کی ہوئی۔ اسی دوران ڈاکٹر سوکرتا پال کمار آ گئیں، جو آنے والوں کا خیال رکھ رہی تھیں۔ پال صاحب کی دعائیہ مجلس کی تیاریاں کر رہی تھیں، آنے والوں کے روایتی سوالات کے جواب دے رہی تھی۔ میرے پاس تو پوچھنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔

بظاہر سوکرتا ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی تھی، مگر ان کی آنکھوں میں باپ کی شفقت گم ہو جانے کا درد صاف نظر آ رہا تھا۔ بجھی بجھی ویران آنکھیں۔ سب کچھ اپنی جگہ پر تھا بس ایک پال صاحب نظر نہیں آ رہے تھے۔ تبھی میری نظر پال صاحب کی دو پینٹنگ پر پڑی جو شاید سوکرتا کی بنائی ہوئی تھی۔ پینٹنگ کے آگے کچھ پھول رکھے تھے۔ مردہ پھول، مجھے پال صاحب کی کہی کہانی کا وہ حصہ یاد آ گیا جس میں وہ کہتے ہیں:

''تصویریں ہی اصل ہیں، جو رہ جاتی ہیں'' (باقی سب گمان ہے) تو کیا پال صاحب محض گمان تھے؟ اچانک میری نظر اس کرسی پر پڑی جس پر بیٹھ کر انہوں نے اپنی پچھلی ملاقات کے دوران میرے پوتے نبا الظفر کو پیار کیا تھا۔ میرے بیٹے ثنا الظفر کو ڈھیر ساری دعائیں دی تھیں۔ مجھ سے ٹیگور کی گیت انجلی، منٹو اور بیدی کے افسانوں پر گھنٹوں باتیں کی تھیں، پھر وہ بہت سی باتیں اپنی ذات سے متعلق کرنے لگے۔ وہ کہنے لگے کہ فنکار کی زندگی ذلیل ہونے کا نام ہے۔ تم جتنا زندہ رہو گے تمہیں ذلالت سے پالا پڑتا رہے گا۔ کبھی دوسرے تمہیں اپنا ہدف بنائیں گے، کبھی تم اپنا ہدف آپ بنو گے اور تم جتنا ذلیل ہو گے اتنے بڑے فنکار بنو گے۔ میں ذلیل ہو ہو کر تھک گیا ہوں۔ اب تو اس انتظار میں ہوں کہ اس ذلالت سے کب نجات ملے۔

پال صاحب ذلالت سے نجات پا گئے۔ انہیں موکش پراپت ہو گیا اور اب وہ امر ہو گئے۔ مر تو ہم گئے، ہمارے اندر یقیناً کوئی چیز مر گئی ہے، جس کا غم ہمیں ہے، جس چیز کے لئے ہمیں تکلیف ہو رہی ہے، جو ہمیں درد دے رہا ہے، جو برداشت سے باہر ہوتا ہے تو آنسو نکل آتے ہیں۔ یہ آنسو عقیدت کے نہیں اپنی تکلیف کے ہیں اور یہ تکلیف اب شاید دائمی ہے، کیوں کہ جوگندر پال اپنی مختلف شکلوں، مختلف کرداروں میں زندہ رہیں گے۔ ہماری تکلیف یہ ہے کہ ہم انہیں دیکھ نہیں پائیں گے، ان سے باتیں نہیں کر سکیں گے۔

افسانے کی کاریگری

افسانے کی ساری کاریگری دراصل اس کے بیساختہ اور غیر رسمی کردار میں مضمر ہے اور اس اعتبار سے افسانہ لکھنے کے اتنے ہی طریقے ہیں، جتنے نہ صرف سارے لوگ بلکہ ان کی مختلف قلبی وارداتوں کے سارے امکانات۔ چند مخصوص نہجوں میں افسانے کی پیشکش پر اصرار میرے نزدیک اس کی کردار کشی کی معصوم جہت کے مترادف ہے۔ افسانے کے افسانے کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے بدلتے تیور انسان ہی کے پیہم انقلاب پذیر تیوروں کی تاریخ سے وابستہ ہیں اور میرا خیال ہے کہ کسی بھی افسانہ نگار کو اس تغیر کے عرفان کے بغیر چارہ نہیں۔

—— جوگندر پال

PDF Compressor Free Version

احمد علی جوہر

Room No. 236-E, Brahmaputra Hostel, JNU, New Delhi 110067.(Mob. 9968347899)

عہد ساز افسانہ نگار: جوگندر پال

جوگندر پال اردو کے صف اوّل کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ ۵ر ستمبر ۱۹۲۵ء کو سیالکوٹ کے ایک گاؤں ''چاوناں'' میں پیدا ہوئے اور بی۔اے تک کی تعلیم وہیں حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں جب تقسیم ہند کا سانحہ پیش آیا تو وہ اپنے والدین کے ساتھ ہجرت کر کے انبالہ آ گئے۔ اس کا اثر ان کے فکر وفن پر بھی پڑا۔ ان کے تخلیقی سفر کا آغاز شعر گوئی سے ہوا، مگر کہانیوں سے طبعی مناسبت کی وجہ سے وہ بہت جلد اس کی طرف مائل ہو گئے۔ اردو افسانہ کے معتبر محقق مرزا حامد بیگ کے مطابق ان کا پہلا افسانہ ''تعبیر'' ۱۹۴۴ء میں مرے کالج میگزین میں شائع ہوا تھا۔ (۱) ان کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ان کی کہانی ''تیاگ سے پہلے'' سے ہوا۔ یہ کہانی ۱۹۴۵ء میں شاہد احمد دہلوی کے رسالہ ''ساقی'' میں شائع ہوئی تھی۔ جوگندر پال اردو ادبی دنیا میں افسانہ نگار کی حیثیت سے اس وقت مشہور ومقبول ہوئے جب ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''دھرتی کا کال'' کے عنوان سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ کے علاوہ ان کے دیگر افسانوی مجموعوں میں ''میں کیوں سوچوں''، ''رسائی''، ''مٹی کے ادراک''، ''لیکن''، ''بے محاورہ''، ''بے ارادہ''، ''کھلا''، ''کھودو بابا کا مقبرہ'' ہیں۔

جوگندر پال ایک طویل عرصہ سے بستر علالت پر تھے۔ بالآخر، بروز ہفتہ، ۲۳ر اپریل، ۲۰۱۶ء کو انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ وہ اگر چہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے، مگر اپنی بیش بہا ادبی تخلیقات کی وجہ سے وہ صدیوں ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ ان کا شمار اردو کے چند گنے چنے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے فکر وفن کے نئے در یچے کھولے اور فن افسانہ نگاری میں وسعت پیدا کی۔ ان کے افسانوں میں موضوعات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے موضوعات براہ راست زندگی سے اخذ کرتے ہیں اور کرداروں کے مکالموں کے ذریعے اصل مسئلہ کی طرف کچھ اس طرح اشارہ کرتے ہیں کہ وہ قاری کے حافظہ کا حصہ بن جاتا ہے۔ موضوعات کی پیش کش کا یہ طریقہ جوگندر پال کی فکر کی گہرائی اور وسعت کو ظاہر کرتا ہے اور ان کی انفرادیت کا پتہ دیتا ہے۔ وہاب اشرفی ان کی افسانہ نگاری کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''جوگندر پال اپنے افسانوں کے موضوعات کے لیے زندگی کے مسائل کی طرف براہ راست رجوع کرتے ہیں اور ان پر اپنے کرداروں کی زبان سے خاصے تیکھے تبصرے کرواتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا یہ تیور انھیں ایک فکری ساخت دے دیتا ہے اور ان کی انفرادیت نئے لکھنے والوں میں مسلم ہو جاتی ہے۔'' (۲)

جوگندر پال کی افسانہ نگاری کا ابتدائی زمانہ کینیا، جنوبی افریقہ میں گذرا۔ وہاں وہ ایک طویل عرصہ تک مقیم رہے۔ اس دوران انہوں نے وہاں کے لوگوں کی زندگی اور اس کی پیچیدگیوں کو بہت قریب سے دیکھا اور اس زندگی کے گوناگوں مسائل ومشکلات کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی، اس لیے ان کے ابتدائی افسانے افریقی زندگی اور ماحول کے عکاس نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں میں انھوں نے مشرقی افریقہ کے سیاسی اور سماجی ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے اس سرزمین پر انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ اور افریقیوں پر ہوئے مظالم واستحصال اور ان کی دُکھ بھری زندگی کو موثر انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

جوگندر پال جب جنوبی افریقہ سے مکمل طور پر واپس ہندوستان آئے تو وہ کچھ دنوں حیدرآباد میں رہے، پھر ایک طویل عرصے تک

PDF Compressor Free Version

اورنگ آباد، پھر مکمل طور پر دہلی میں قیام پذیر ہوئے۔ انھوں نے ہندوستان کے چھوٹے بڑے مختلف شہروں کی زیارت کی، اس سے انھیں انسانی زندگی کو الگ الگ رنگوں میں دیکھنے کا موقع ملا، ان کے مشاہدہ میں وسعت پیدا ہوئی اور مختلف مسائل وموضوعات نے ان کے افسانوں میں جگہ پائی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کا کینوس وسیع نظر آتا ہے۔

جوگندر پال کی کہانیوں میں بیک وقت دو سطحیں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک وہ جو عام قاری کے ابلاغ کی سطح ہوتی ہے۔ دوسری وہ جو کہانی کی داخلی سطح ہوتی ہے۔ اس میں فکر کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ یہ سطح کہانی کو اس کے ظاہری مفہوم سے آگے لے جانے کا مطالبہ کرتی ہے اور اس طرح کہانی میں ایک نئی معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔

جوگندر پال نے سات دہائیوں سے زیادہ عرصہ پر محیط اپنے افسانوی سفر میں کئی نمائندہ افسانے اُردو ادب کو دیے جن میں ''بوُ''، ''رسائی''، ''مہابھارت''، ''کتھا ایک پیپل کی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ''بوُ'' میں اس حقیقت سے پردہ اُٹھایا گیا ہے کہ سرکاری اسپتالوں میں کیسے نااہل ڈاکٹر عوام کے علاج ومعالجہ کی خدمات پر مامور کیے جاتے ہیں جن کی ساری توجہ رشوت خوری اور کالے دھن کی کمائی پر ہوتی ہے۔ یہ نااہل ڈاکٹر اسپتال کی دوائی سے لے کر اوزار تک بیچ ڈالتے ہیں اور اپنی کمائی کے لیے عام انسانی جانوں کے ساتھ بھی کھلواڑ کرتے ہیں۔ جب زندہ انسانوں سے ان کی ہوس پوری نہیں ہوتی ہے تو اسپتال میں پڑی لاشوں کو بھی فروخت کرنے کا کاروبار کرنے لگتے ہیں۔ افسانہ کا مرکزی کردار ڈاکٹر سروپ ہے جو سرکاری اسپتال کا ایک نااہل ڈاکٹر ہے۔ اسے رشوت کھانے اور کالے دھن کمانے میں بڑی مہارت ہے۔ اسے شراب کی زبردست لت لگی ہوئی ہے۔ انسانی واخلاقی اقدار اس کے لیے بے معنی ہیں۔ اسے اپنی بیوی بچوں سے بھی محبت وہمدردی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی پیاس ان سے بھی زندہ نہیں ہوتی۔ اس کی بیوی اس سے کہتی ہے:

> ''ارے او سرو، تمہارے بیوی ہے، پھول سی بچی ہے ہم سے تمہاری پیاس زندہ کیوں نہیں ہوتی؟' پھر ناری کو یکلخت اپنی بے بسی پر غصہ آنے لگتا ہے۔ 'تم.... تم مردوں کے ڈاکٹر ہو سرو، تم کیا جانو، کسی بے کل روح کی بجی بجی سانسیں اکٹھی کر کے اسے اپنے پیروں پر کیسے کھڑا کیا جا سکتا ہے؟'' (۳)

اس اقتباس میں جوگندر پال نے نااہل اور بے ضمیر ڈاکٹر کی بے حسی پر بڑا گہرا طنز کیا ہے۔ اس افسانہ میں انھوں نے عصر حاضر کے انسان کی بے ضمیری پر ماتم کرتے ہوئے، سماج میں معدوم ہوتی ہوئی انسانیت کے المیہ کو فن کارانہ مہارت سے اُجاگر کیا ہے۔

افسانہ ''رسائی'' میں جوگندر پال نے رشوت خوری، منافقت، ریاکاری اور چور بازاری جیسے مسائل کو بے نقاب کیا ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار رام پرشاد ہے جو بظاہر بڑا اچھا جیوتشی ہے، مگر دراصل ایک جیوتشی کے بھیس میں وہ نشیلی اشیا کی سوداگری کرتا ہے اور بہت سارے ممالک کا جاسوس ہے۔ اپنے اسی دھندے کی خاطر اس نے جیوتش کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے:

> ''اب آپ سے کیا پردہ.....؟ دراصل یہی دھندا کرنے کے لیے میں نے جیوتش کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ میرے پاس بے حساب کوکین، افیون، گانجا اور بھانت بھانت کی نشیلی جڑی بوٹیاں مشرقی ممالک سے پہنچتی ہیں اور میرے ایجنٹ میرے جیوتش کے پرستار بن کر آتے ہیں اور میرا مال فوراً کلیر ہو جاتا ہے۔'' (۴)

جوگندر پال نے اس افسانہ میں جاسوسی اداروں کی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہوئے عصر حاضر کی گھناؤنی سیاست اور حکومت کی خود غرضانہ چالوں پر بڑا گہرا طنز کیا ہے۔ افسانہ کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''ہمارے دور کا سارا کاروبار 'ڈرگز' سے ہی چل رہا ہے۔ ہمارے فنانس منسٹرز اچھی خاصی ڈرگ لینے کے بعد ہی اپنی اپنی قوم کا سالانہ بجٹ پیش کرتے ہیں اور حزب مخالف کے ان گنت اعتراضات کا نہایت چین سے مسکرا مسکرا کر جواب دیتے ہیں۔'' (۵)

''مہابھارت'' میں جوگندر پال نے دورِ حاضر کی خواتین کے استحصال کی جھلک پیش کی ہے اور ''کتھا ایک پیپل کی'' میں سماجی ناہمواری، طبقاتی

PDF Compressor Free Version

نابرابری اور نچلے اور پست طبقے پر ہو رہے ظلم وستم کی پر اثر داستان بیان کی ہے۔ جوگندر پال نے اپنے بعض افسانوں میں شہری زندگی کے بہت اچھے نقوش کھینچے ہیں۔ ''سواریاں'' اور ''بازدید'' کا شمار ان کے ایسے ہی افسانوں میں ہوتا ہے جن میں شہر کی ہنگامہ خیزی، مشینی زندگی اور اس کی مشکلات ومسائل کو دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

جوگندر پال نے سیدھے سادے بیانیہ انداز میں بھی افسانے لکھے ہیں اور بہت سے افسانوں میں علامتی طرز اظہار اختیار کیا ہے۔ ان کے علامتی افسانوں میں علامت بھرتی کے لیے استعمال نہیں ہوتی بلکہ وہ کہانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے کامیاب علامتی افسانے خارجی زندگی کے وسیع تر مفہوم کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں تجریدیت کے تجربے بھی کیے، مگر بہت جلد وہ اس تجربہ سے تائب ہو کر کہانی پن اور کردار نگاری کی طرف واپس لوٹ آئے۔

جوگندر پال کے بیشتر افسانوں میں فکر کا عنصر غالب ہے اور ان کا لب ولہجہ استفہامیہ ہے۔ ان کے اکثر افسانے قاری کے لیے سنجیدہ سوال چھوڑ جاتے ہیں اور انھیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ''عفریت''، ''عمود''، ''وادیاں''، ''کھودو بابا کا مقبرہ''، ''بیک لین''، ''اس طرف'' وغیرہ اس نوع کے نمائندہ افسانے ہیں۔ جوگندر پال کا کمال یہ ہے کہ ان کے اس قسم کے افسانوں میں فکر وفلسفہ اور استفہامیہ لب ولہجہ کی کارفرمائی کے باوجود، کہانی میں بوجھل پن پیدا نہیں ہوتا بلکہ دلچسپی اور دلکشی کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''جوگندر پال ان ادیبوں میں سے ایک ہیں جن کی تحریروں میں سوچ کا عنصر روشنی کی درخشندہ گزرگاہوں کی طرح صاف نظر آتا ہے۔ ان کی فکر شبنم کی طرح شفاف اور خوشبو کی طرح تازہ ہے۔ یہ کسی فلسفے یا نقطۂ نظر سے ماخوذ یا اس کی تشہیر کا وسیلہ نہیں بلکہ اس کے حسی تجربات سے پھوٹی ہے اور اسی لئے بے حد دلکش اور منفرد لگتی ہے۔'' (۶)

پروفیسر قمر رئیس، جوگندر پال کی انفرادیت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> ''فن کے معاملے میں جوگندر پال نے اس کی ریاضتی تعریف کو قابل اعتنا نہیں سمجھا اور انہوں نے اپنے تخلیقی شعور اور جمالیاتی وجدان پر زیادہ بھروسہ کیا اور اپنے مواد کو تخلیقی اظہار کی ایسی سطح سے پیش کیا کہ وہ افسانہ کی روح سے تعرض کیے بغیر اس کی ایک الگ شناخت بن گئی ہے۔ افسانہ ہو یا ناول جوگندر پال کی ہر نئی تخلیق ایک نئی واردات، نئے تجربے کا مظہر ہوتی ہے۔ ان تخلیقات میں جو شے مشترک ہوتی وہ ہے مصنف کی دردمندی، عصری مسائل کا ادراک اور عام انسان کے دکھ درد سے گہری وابستگی۔ وہ زندگی کے عام اور معمولی واقعات میں آسانی سے دوررس نفسیاتی اور تہذیبی حقائق کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ ان کا وژن آفاقی ہے اور ان کے بیشتر افسانے ایک نئی جمالیاتی حسیت کا احساس دلاتے ہیں جس سے ان کے فن کی منفرد شناخت قائم ہوتی ہے۔'' (۷)

جوگندر پال کے افسانوں کے جائزے سے احساس ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھے افسانہ نگار کے لیے لازمی ہیں۔ وہ کردار، واقعہ، قصہ پن اور پس منظر کے لوازم کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ پلاٹ کی تشکیل میں وہ ایک خاص معیار قائم رکھتے ہیں۔ وہ واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ افسانہ پڑھتے وقت قاری کو اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ کردار نگاری میں بھی ان کا فنی شعور عروج پر ہے۔ وہ کردار کی داخلی وخارجی دونوں خصوصیات کو اُجاگر کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں ایک تخلیقی دنیا کو پیش کرتے ہیں اور فرضی واقعات کی مدد سے ایک ایسی صورت حال اُبھارتے ہیں کہ ان کی تصویر حقیقی نظر آتی ہے۔ زبان وبیان کے لحاظ سے بھی ان کے افسانے دلکش اور جاذب توجہ ہیں۔ غرض یہ کہ انھوں نے اُردو افسانہ نگاری کے میدان میں اپنی فکری وفنی مہارت اور اپنے فن کارانہ کمال کا ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ ان کا شمار اپنے عہد کے بلند پایہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا مطالعہ کرتے ہوئے، م۔م۔ راجندر نے بڑی دلچسپ رائے کا اظہار کیا

(بقیہ ص ۲۵ پر)

PDF Compressor Free Version

سلمان عبدالصمد

N- 106, 1st Floor Abu Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi (Mob.8287287093)

جوگندر پال: فسانۂ حیات اور چند افسانے

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ تاہم گزشتہ دنوں، دنیائے اردو ادب میں ہونے والا موت کا رقص انتہائی ہولناک ثابت ہوا۔ جانے والے ادیبوں کے تلق اور صدمے کا معاملہ ہی نہیں، بلکہ ہم ایک کی تجہیز وتکفین سے مکمل طور پر فارغ بھی نہیں ہوئے کہ دوسری اندوہناک خبر ہمیں اندر تک دہلاتی چلی گئی۔ انتظار حسین کے فوراً بعد عابد سہیل کا بلاوا، زبیر رضوی کے معاً بعد ندا فاضلی کا جانا، پھر ملک زادہ کے نقش پا پر فی الفور جوگندر پال کو قدم رکھتے دیکھنا، کتنا دلدوز ہے۔ ان سب سے قطع نظر جوگندر پال کو ہی آواز دیتا ہوں۔ جوگندر پال تجھے زندگی بھر اس ''موت'' کا انتظار تھا، تاہم جانا تجھے ہی تھا، سو تو چلا ہی گیا، لیکن تیری یادیں اور تیری باتیں محفوظ ہیں اور رہیں گی بھی!

جوگیندر پال نہ صرف افسانہ نگار تھے، بلکہ ناول کی دنیا کو بھی انھوں نے آباد کیا۔ ان کے فکر وفن کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے فلسفیانہ اساس کی بنیاد پر نہ روایتی بن پائے اور نہ ہی اپنے معاصرین کی صف میں محمود وایاز کی طرح کھڑے ہوگئے۔ فلسفیانہ اساس، گہرے تجزیاتی عناصر، رشتوں کا احساس اور اپنی راہ کا تن تنہا مسافر بننے کی دھن نے انھیں منفرد مقام عطا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اصناف کی رنگارنگی اور تصانیف کی کثرت سے بھی اپنے ہم عصروں میں وہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ نصف صدی سے زائد عرصہ میں انھوں نے تقریباً ایک درجن افسانوی مجموعے اور سات ناول یا ناولٹ سے دامن اردو کو آب دار بنایا ہے۔ ''میں کیوں سوچوں'' (۱۹۶۲ء) ''رسائی'' (۱۹۶۹ء) ''مٹی کا ادراک'' (۱۹۷۰ء) ''لیکن'' (۱۹۷۷ء) ''بے محاورہ'' (۱۹۷۸ء) ''دھرتی کا کال'' (۱۹۶۱ء) ''بے ارادہ'' (۱۹۸۱ء) ''کھودو بابا کا مقبرہ'' (۱۹۹۴ء) ''کتھا نگر'' (۱۹۸۶ء) ''کٹھلا'' (۱۹۸۹ء) ''بستیاں'' (۲۰۰۰ء) نامی افسانوی مجموعوں کے علاوہ افسانچہ کا ایک مجموعہ ''سلوٹیں بھی'' انھوں نے یادگار چھوڑا، جب کہ ان کے ناول یا ناولٹ کچھ اس طرح ہیں: ''رابطہ'' (۱۹۷۹ء) ''آمد ورفت'' (۱۹۷۵ء) ''بیانات'' (۱۹۷۵ء) ''نادید'' (۱۹۸۳ء) ''ناول، ایک بوند لہو کی'' (۱۹۶۲ء) ''پار پرے (ناول) خواب رو (۱۹۹۱ء) اسی طرح ''جوگیندر پال کی کہانیاں'' (۲۰۰۵ء) اور جوگیندر پال کی پچیس منتخب کہانیاں ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آئیں اور ''بے اصطلاح'' نامی مجموعۂ مضامین بھی ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔

سیالکوٹ میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہونے والے جوگیندر پال کی پہلی کہانی ''تعبیر'' کالج میگزین میں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ تب سے وہ متواتر لکھتے چلے آئے۔ ان کی زندگی نشیب وفراز سے بھری ہے۔ افریقہ کے تپتے صحراؤں میں انھوں نے تقریباً چودہ سال گزارے اور وہاں کے مظلومین کی داستانوں کو پہلے افسانوی مجموعہ میں قید کیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد اورنگ آباد کے ایک کالج میں بطور پرنسپل فریضہ انجام دیا، پھر دہلی چلے آئے اور یہیں ۱۳ اپریل ۲۰۱۶ء کو ان کی سانس کی ڈور ٹوٹ گئی۔

جوگندر پال نے انہماک کے ساتھ اپنا افسانوی سفر جاری رکھا۔ کہنے والوں نے یہاں تک کہا کہ ان کا انہماک عبادت کے مقام تک پہنچ گیا۔ کلیہ یہ ہے کہ فریضہ عبادت کی ادائیگی میں جہاں انہماک ہوتا ہے، وہیں تسلسل کا عنصر بھی وجود میں آجاتا ہے۔ ان کے یہاں انہماک بھی ہے اور تسلسل بھی۔ مسلسل لکھنے کی وجہ سے ان پر زود نویسی کا الزام عائد ہوا۔ معاصر فکشن میں بھی ایسے کئی نام ہیں، جن پر یہی الزام ہے۔ اس الزام کے بعد عموماً ادیبوں سے نظریں چرائی جانے لگتی ہیں۔ حالانکہ زود نویسوں کی تحریروں سے بے اعتنائی ادب کے لیے قاتل

PDF Compressor Free Version

تحسین امر نہیں۔ جوگندر پال نے دنیا دیکھی ہے اور دیکھنے کے ساتھ تخیلاتی دماغ کو بیدار اور تجزیاتی نظریں کھلی رکھیں، تو ظاہری بات ہے کہ وہ مسلسل لکھیں گے ہی اور ان کے لکھنے کا طریقہ بھی مختلف ہوگا۔ کہانی کی پیشکش میں نئی نئی تکنیک اپنائیں گے۔ وہاب اشرفی نے لکھا ہے:

''تلازمے کی بنیاد پر بھی افسانے لکھے جاسکتے ہیں اور کامیابی سے، اس کی مثال جوگندر پال کے افسانوں سے دی جاسکتی ہے۔ جوگندر پال کبھی خالص بیانیہ انداز اپناتے ہیں۔ کبھی اسٹرن کی متضاد دستوں میں چھلانگ لگا کر بیانیہ کے شکست وریخت کے عمل سے گزرتے ہیں۔ کبھی کتھاؤں کی وادی کی سیر کرنے لگتے ہیں، لیکن فن کے تقاضوں سے کبھی منھ نہیں موڑتے۔''(۱)

حقیقت یہی ہے کہ جوگندر پال نے زندگی کو مختلف رنگوں میں دیکھا۔ سرحدوں کی لکیریں دیکھیں۔ انسانی جسموں کے مختلف رنگوں کو پرکھا۔ اسی بنیاد پر ان کے مشاہدے کا دائرہ ان کے فکشن میں مزید وسیع ہوتا چلا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے جو راہ بنائی، اس کے وہ تن تنہا مسافر ٹھہرے۔ ان کا کہانی برتنے کا انداز، تکنیکی سروکار اور اسلوب نگارش معاصرین سے جداگانہ ہے۔ سرسری نظروں سے پڑھنے کے بعد ان کے یہاں کہانی پن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے اسی سروکار کے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''جوگیندر پال کا افسانوی ماحول سطحی نظر میں افسانوی نہیں معلوم ہوتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ وہ حضرات جو افسانے کو کوئل، نازک سیدھا سپاٹ فن سمجھتے ہیں، انھیں جوگیندر پال کو پڑھ کر سخت مایوسی ہوگی۔''

وہاب اشرفی کی یہ رائے جوگندر پال کی بیشتر کہانیوں پر صادق آتی ہے۔ ذیل میں ہم ان کی چند کہانیوں کا اجمالی تجزیہ کر رہے ہیں، تاکہ ان کا افسانوی رنگ ہمارے سامنے آجائے۔ ''کھودو بابا کا مقبرہ'' جوگیندر پال کا ایک افسانوی مجموعہ ہے۔ جن کی بیشتر کہانیاں پروفیسر وہاب اشرفی کے قول کی موید ہیں۔ جب کہ جوگیندر پال اپنے تعلق سے لکھتے ہیں:

''بہ حیثیت ادیب میں اپنی ذات میں بے شناخت ہوں، یا پھر میری شناخت کے نقوش کائنات کے سبھی مظاہر میں مضمر ہیں۔ میں جو کچھ بھی دیکھتا ہوں وہی بن جاتا ہوں، یہی میری شناخت ہے۔''(۲)

یہ حقیقت ہے کہ ابتدائی یا پھر افریقہ کے تپتے صحرا میں لکھی گئی اپنی کہانیوں میں جوگندر پال وہ رنگ پیدا نہ کر سکے، جو ان کا شناخت نامہ بن پائے، لیکن زمانہ وسط کی کہانیوں میں نقوش کائنات کے مظاہر، ان کے لیے شناخت بنتے چلے گئے۔

اس مجموعہ کی کہانی ''کھودو بابا کا مقبرہ'' میں جوگندر پال نے علامتی طور پر دنیا میں پھیلی انارکی، بے مروتی اور رشتوں کی ٹوٹتی بکھرتی کرچیوں کو جمع کر کے فلسفیانہ اساس پر ایک عمدہ کہانی بننے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کا یہ علامتی رویہ فقط علامتی اشاریہ نہیں، بلکہ خالص بیانیہ انداز میں معاشرہ سے بالکل ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ کتے اور کتیا کے بیانیہ میں انھوں نے جانوروں کو انسانی سماج سے جوڑ دیا ہے، اس لیے بندھو کتا جو علامتی طور سے پہلی دفعہ کہانی میں آتا ہے، وہ محض علامت نہ رہ کر انسانی معاشرہ کا ایک جیتا جاگتا ''انسان'' بنتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح یہ جانور کبھی علامت تو کبھی اپنے مکمل وجود کے ساتھ انسان کا خیر خواہ اور وفادار معلوم ہوتا ہے۔

جوگندر پال چاہتے تو دیگر علامتی افسانوں اور ناولوں کی طرح ہی اس افسانہ کو بھی ابتدا سے انتہا تک خالص علامتی انداز میں پیش کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے اپنے دائرہ علامت کو اس قدر پھیلا دیا کہ اس میں پورے انسانی معاشرہ کا تانا بانا بھی سما گیا۔ بندھو کتا جب کوراں تائی کے پاس سے کھودو بابا کے لیے دانتوں میں دبا کر چٹنی میں سنی روٹی لاتا ہے تو وہاں ایک جانور انسان کا ہمدرد بن کر سامنے آتا ہے۔ تائی پریشانی میں مبتلا ہے، لیکن اسی محلہ میں رہنے والے کسی انسان کو اس کی پریشانی کی خبر نہیں، جب کہ ایک کتا اس سے باخبر ہے اور اس کی تکلیف میں برابر کا شریک بھی، پھر جب کھودو بابا بندھو کتے کے ذریعہ کوراں تائی کے حالات سے واقف ہوتا ہے تو وہ جنس کا دھندہ کرنے والی مدر بابا کو تائی کی خدمت کے لیے بھیج دیتا ہے۔ ان دونوں جزئیات کے سہارے جوگندر پال نے جہاں خوشحال اور انسانیت کے علمبردار معاشرہ پر طنز کیا

PDF Compressor Free Version

ہے، وہیں یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ سماج کے دبے کچلے اور دقت کے ہاتھوں مجبور افراد بھی سماج کے اٹوٹ انگ ہیں، حتی کہ بعض اوقات جانور بھی۔ منٹو نے جس طرح جنسیت کی اندھیری کوٹھریوں میں انسانیت اور ہمدردی کے دیے روشن کیے، اسی طرح جوگندر پال کی کہانی میں بھی ہمیں ہمدردی اور حقیقت بیانی کے دیے روشن نظر آتے ہیں۔

اس کہانی میں بندھو کتے کو دو پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے، جب وہ انسانی معاشرہ کی مدد کرتا ہے تو اس کردار کی حقیقت کچھ اور ہوتی ہے اور جب وہ اپنی مخالف جنس چھبیلی کتیا کو سکون پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ کردار کچھ اور بن جاتا ہے۔ یہاں پر پتا چلتا ہے کہ جانور نہ صرف جانوروں کا خیال رکھ رہا ہے، بلکہ انسانی سماج سے جڑتے ہی انسانوں کا ہمدرد و معاون بھی بن جاتا ہے، لیکن وائے حسرتا کہ انسان، انسان کے حق میں بھی انسان نہیں بن پایا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان آج اپنے جیسے انسانوں کی محبت کے لمس کا طلبگار ہے، لیکن یہ بھی اسے نصیب نہیں اور عالم یہ ہے کہ:

''ہم انسان ہیں مگر ترستے رہتے ہیں کہ کوئی کتا سمجھ کر ہی پچکارلے۔'' (۳)

یہ کہانی ارتکاز کے ساتھ آگے بڑھتی ضرور ہے تاہم طوالت اور جزئیات کی کثرت کی وجہ سے اس میں ناول کے کینوس کا احساس ہوتا ہے، اسی لیے تقریباً تیس صفحات پر مشتمل اس افسانہ میں اساسی طور پر کوئی ایک کہانی شروع سے آخر تک نظر نہیں آتی۔ پلاٹ تبدیل ہوتے ہی پلاٹ کا مکمل تجزیہ سامنے آجاتا ہے۔ چنانچہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ کہانی اتنی طویل نہ ہو کر چند صفحات بعد جہاں بھی ختم ہوتی، وہیں پر مکمل معلوم ہوتی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ناول فلسفہ کا متقاضی ہے یا اس میں فلسفہ کی گنجائش نکلتی ہے، تاہم کہانیوں کا چھوٹا حجم اس کے لیے مناسب نہیں، لیکن جوگندر پال کی اس کہانی سے پتا چلتا ہے کہ نہ صرف ناول بلکہ فلسفیانہ اساس پر کہانی بھی بڑی عمدگی سے بنی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کھودو بابا کے منہ سے نکلنے والے جملے فلسفیانہ اساس کے ساتھ ساتھ اس قدر عام فہم ہیں کہ قاری کا ذہن گدگدا جاتا ہے۔ اس طرح یہ فلسفہ، نہ الجھاوے پیدا کرتا ہے اور نہ ہی تخیلات کی کسی ماورائی وادی میں ہمیں پہنچاتا ہے، بلکہ اس فلسفہ میں فلسفی اور غیر فلسفی دونوں کے لیے پیغامات پنہاں ہوتے ہیں۔

دوسری کہانی ''کہاں'' میں لائسنس بطور علامت استعمال ہوا ہے کہ رشتے لائسنس کے محتاج نہیں، لیکن آج انسانوں کی خودغرضیاں رشتوں میں لائسنس کی حیثیت اختیار کر گئیں کہ مطلب ختم، رشتہ ختم! جس کی بنیاد پر سماج میں رشتوں کے تقدس کا سرا، اس طرح غائب ہوگیا کہ کہیں کوئی سراغ ملتا ہی نہیں:

''تمہارے دفتر کی چابی میری ساڑیوں میں کیسے ملے گی، کوئی شے کسی غلط مقام پر پہنچ کر ہی تو گم ہوتی ہے۔'' (۴)

اس کہانی کا راوی ''میں'' اپنی گاڑی کا لائسنس کھو جانے سے پریشان ہے۔ وہ متعدد فائلوں میں اس کو تلاش کرتا ہے۔ تاہم کہیں بھی اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔ تلاشی مہم میں البتہ اسے وہ کاغذات ملتے ضرور ہیں، جن کی فوری کوئی ضرورت نہیں، لیکن یہی کاغذات ضرورت کے وقت چھان مارنے سے بھی نہیں مل رہے تھے۔ کہانی نگار نے علامتی طور پر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسانی زندگی میں جس چیز کی اہمیت ہے، اس پر توجہ نہیں دی جارہی ہے، رشتوں کی بحالی پر غور وخوض نہیں ہو رہا ہے، جس کی بنیاد پر زندگی کے ہر شعبہ میں لائسنس کی صورتحال پیدا ہوگئی ہے۔

''بے گور'' نامی افسانے میں ہندوستان کی امریکہ نوازی اور غلامانہ رویہ پر طنز ہے۔ اس طنز میں جہاں ایک طرف انسانوں کی بے قیمتی کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں امریکہ کی نگاہ میں پوری دنیا نرم چارہ کی حیثیت سے سامنے آتی ہے، جس سے احساس ہوتا ہے کہ غیر ملکی اعلیٰ دماغوں کے ذریعہ امریکہ نے نہ صرف اپنے ملک کے دائرہ کو وسعت دینے کی کوشش کی بلکہ سائنسی تجربات کے لیے بھی اگر مردوں کی ضرورت ہو تو انھیں غیر ملکیوں کا ہی جسم چاہئے۔ ہندوستان آنے کے بعد امریکی ڈاکٹر پچاس لاش کا انتظام کرنے کی ذمہ داری رام دین نامی شخص کو دیتا ہے۔ مردوں کی حصولیابی کی خبر جب ملتی ہے تو ڈاکٹر خوش ہوتا کہ طبی معائنہ کے لیے اسے لاش مل گئی۔ چنانچہ وہ رام دین کے ساتھ مردوں کے پاس پہنچتا ہے، جہاں مردے نہیں، زندہ لاش موجود ہیں:

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں صاحب، مردوں کو تو مرچکنے کا احساس بھی نہیں ہوتا، مگر انھیں غور سے دیکھئے، ہر ایک کو

PDF Compressor Free Version

پورا احساس ہے کہ مر چکا ہے۔" (۵)

ان جملوں سے طنز کی لو اور تیز ہوتی نظر آ رہی ہے کہ آج دنیا میں زندہ مردے بھی لاتعداد ہیں اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ دنیا میں خونریزیاں منظم طریقے سے ہو رہی ہیں اور سائنسی ایجادات میں بھی نہ جانے کتنی جانیں تلف ہوتی ہیں۔

جوگندر پال کے مطالعہ سے چند ایسی باتیں سامنے آتی ہیں، جو کہ ان کی افسانوی خصوصیات ٹھہرتی ہیں۔ وہ موضوعات کے انتخاب میں معاشرہ کے سلگتے مسئلے کو عموماً ترجیح نہیں دیتے یا ہنگامی موضوعات بہت ہی کم ان کے یہاں جگہ پاتے ہیں، جب کہ عموماً زود نویسوں کے یہاں ہنگامی موضوعات کی کثرت ہوتی ہے۔ البتہ جوگندر پال کے ابتدائی افسانوں میں افریقہ کے مظلومین کی داستانیں، ہنگامی موضوعات کے زمرے میں ہی آئیں گی، تاہم جوں جوں ان کا افسانوی سفر طویل ہوتا گیا، توں توں ان کے موضوعات میں زندگی کی باریکیاں اور اس کی نارسائیاں جگہ پاتی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس باریک نقطہ کو بھی کہانی کا موضوع بنا لیتے ہیں جس پر عام کیا، خاص ذہن و دماغ بھی غور نہیں کرتا ہے۔ اس ضمن میں کہانیاں "اشجار"، "بکریاں" اور "کہاں" توجہ طلب ہیں۔ البتہ انسانی زندگی کے ایسے ایسے فلسفے کو موضوعات بنانے سے ان کے افسانوں کی تفہیم میں تھوڑی سی دقت ضرور پیدا ہوگئی۔ جوگندر پال انتخاب موضوعات کے معاملہ میں ہمیشہ اپنے معاصرین، متقدمین بلکہ "متاخرین" سے مختلف نظر آتے ہیں۔ کہانی کی پیشکش میں وہ جن فلسفیانہ رویوں کا سہارا لیتے ہیں، وہ محض فلسفہ نہ بن کر زندگی کی سچائی اور حقیقی تصویر بن جاتی ہے، پھر رشتوں کے تقدس اور انسانی وجود میں شامل خیر کا مادہ، ان کے ہاں دلکش انداز میں سامنے آتا ہے اور انسانی زندگی بارونق نظر آنے لگتی ہے۔

جوگندر پال کے فلسفیانہ اساس میں تخیل کی جو آمیزش ہے، وہ نہ ہمیں ماورائی دنیا میں پہنچاتا ہے اور نہ ہی نقطہ تحیر و تجسس میں مبتلا کرتا ہے، بلکہ ان کے تخیل میں غور و فکر کا مادہ ہوتا ہے اور ہم اسی دنیا میں رہ کر اپنی دنیا کے متعلق غور و خوض کرتے ہیں۔ اسی دنیا میں بسنے والے انسان کے تئیں اپنا منفی رویہ تبدیل کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنے وجود کا تجزیہ کرتے ہیں اور اپنے رویوں کو گہری نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ دوسروں کے تئیں ہمارے کیا جذبات و مفادات ہوتے ہیں، ان سب کی باریکیاں ہمارے سامنے پرت در پرت کھلنے لگتی ہیں۔ ان کی کہانیاں، ترسیل و تفہیم کے نقطہ نظر سے عام قاری یا عام انسان کے لیے کچھ نہ کچھ مسائل ضرور پیدا کرتی ہیں، تاہم کہانیوں کے بین السطور اور مختلف مقامات پر فلسفیانہ اساس سے بھرپور جو جملے موجود ہوتے ہیں، وہ ذہن کو گدگدا دیتے ہیں اور کہانی پڑھنے کے بعد بعض اوقات مکمل طور پر نہ سمجھنے کی جو خلش رہ جاتی ہے، یہی جملے اس خلش کو بھی ضرور دور کر دیتے ہیں مثلاً:

(۱) "ہوتا صرف وہی ہے جو ہوتا ہے۔ باقی سب کچھ ہم آپ ہی اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔"

(۲) "اس فائل میں میٹرک سے لے کر ایم اے تک میری ساری سرٹیفکیٹ اور ڈگریاں رکھی ہیں۔ انھیں کھو کر میری ساری قابلیت مشکوک ہو کر رہ جائے۔ انہی کی بدولت آج میں اپنی یونیورسٹی کی انجینئرنگ فیکلٹی کا ڈین بن پایا ہوں۔ اپنی ڈگریوں کے بیشتر مضامین میں بھول چکا ہوں، لیکن میری طرف کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا ہے۔"

(۳) "ہم محبت، نفرت یا جو بھی کرتے ہیں، وہی کرتے ہیں جس کی ہمیں اسی دم حاجت ہو، ورنہ محبوبہ کے گلے میں بانہیں ڈالے ہم اچانک اسے چھوڑ کر لیٹرن کی طرف کیوں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں؟" (۶)

فی الواقع یہ چند جملے ہماری زندگی کے حقیقی عکاس ہیں، جن سے ذہن و دماغ میں گدگداہٹ پیدا ہوتی ہے اور ہم تخیلاتی دنیا میں پہنچ کر بھی اپنی دنیا سے الگ نہیں ہو پاتے ہیں۔ یہ جملے دانستہ طور پر ایک کہانی سے ہی پیش کیے گئے ہیں، تاکہ اندازہ ہو کہ ان کی ایک کہانی میں بھی زندگی کی بیشمار سچائیاں موجود ہوتی ہیں اور فلسفیانہ اساس کے تناظر میں وہ جو کچھ کہہ جاتے ہیں، اس کی روشنی میں زندگی ہمیں باوقعت معلوم ہونے لگتی ہے۔ ان کی بیشتر کہانیوں میں ایسی حقیقتیں موجود ہیں۔

موضوعاتی سطح پر فلسفیانہ اساس کے ذکر کے بعد اگر ہم فنی

PDF Compressor Free Version

نقطہ نظر سے ان کی کہانیوں کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ متعدد کہانیوں میں داستانوی فضا موجود ہے۔ ایک کہانی میں ہی دوسری کہانی سنانے کی روش دکھائی دیتی ہے۔ ''بکریاں'' اور ''کھودو بابا کا مقبرہ'' میں کہانی در کہانی کا جو طریقہ اپنایا گیا، وہ ان کی کہانیوں کو داستانوی فضا سے قریب کر دیتا ہے۔ کہانی در کہانی کی تکنیک سے کہانی کی تفہیم میں ذرا مشکل پیش آتی ہے، کیوں کہ وہ عموماً ایک کہانی میں دوسری کہانی سپاٹ بیانیہ میں پیش نہیں کرتے، بلکہ ڈرامائی کیفیت پیدا کرنا انھیں مستحسن معلوم ہوتا ہے اور جب وہ ڈرامائی اسلوب اپناتے ہیں تو بیک وقت کرداروں کی بھرمار ہو جاتی ہے۔

کرداروں کی زیادتی تو اسٹیج کے پس منظر میں دلچسپ معلوم ہوگی، تاہم قرأت کے دوران معاملہ تھوڑا گنجلک بن جاتا ہے، چنانچہ ترسیل کے لیے ان کی ایسی کہانیوں کو بہت ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا لازمی ہو جاتا ہے۔ کہانی در کہانی کی تکنیک والے افسانوں کے علاوہ بھی ان کے متعدد افسانوں میں قاری کو توقف کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تجریدی افسانہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا کوئی عیب نہیں، البتہ کہانی پن کے ساتھ جو افسانے منظر عام پر آئے، ان میں تجریدی پہلوؤں کا در آنا راقم کی نگاہ میں مستحسن نہیں۔

جوگندر پال کی چند کہانیوں میں تجریاتی عناصر بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ تجریاتی رویے جہاں تفہیم و ترسیل میں آسانی پیدا کرتے ہیں، وہیں ان سے کہانیوں میں صحافتی جھلکیاں آدھمکتی ہیں۔ صحافتی جھلکیوں اور تجریاتی عناصر کے ساتھ آگے بڑھنے والی کہانیوں میں عموماً اختتام تک کہانی کی چاشنی باقی نہیں رہ پاتی۔ کبھی کہانی کے درمیان تو کبھی اختتام سے بہت پہلے ہی کہانی کے ختم ہو جانے کا احساس ہوتا ہے۔ جوگندر پال کی کئی ایک ایسی کہانیاں ہیں، جن میں اختتام سے قبل ہی اختتام کا گمان گزرتا ہے۔ تجریاتی عناصر والی کہانیوں میں پھیلاؤ کی صورت بھی پیدا ہو جاتی ہے، جس سے کہانی کے ارتکاز میں ناول کا وسیع کینوس سماتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بالکل یہی معاملہ جوگندر پال کی ان چند کہانیوں کا ہے، جن میں کہانی در کہانی کی تکنیک ہے یا پھر طوالت کچھ زیادہ ہے۔ انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں اس کا اعتراف کیا ہے:

''افسانے کا معاملہ دگر ہے۔ ایک محدود ایریا میں نظریں گاڑ گاڑ کر آنکھیں پھٹنے کی نوبت آجاتی ہے، مگر یہ بھی کوئی کلیہ نہیں بعض اوقات کسی کسی کینوس پر بھی بے حساب وسعتوں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اپنے طویل مختصر افسانوں مثلاً 'کھودو بابا کا مقبرہ'، 'گرین ہاؤس'، 'گاڑی لکھتے ہوئے' میں مجھے یہی محسوس ہوا۔ کئی بار تو مجھے اپنے کسی افسانے کے باطن میں ہی ایک پورا ناول سمٹا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔'' (۷)

جوگیندر پال کے اس اعتراف سے طویل اور ان مختصر افسانوں پر بھی بحث کا دروازہ کھل جاتا ہے، جو ہیں تو افسانے تاہم مکمل طور پر ان میں ناولٹ یا ناول کی روح سمائی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگر ناولٹ کی روح والے افسانوں کو، افسانے ہی تسلیم کیا جائے تو ان ناولوں کا کیا مقام ہو سکتا ہے، جس کے افسانوی جسم میں ناول کی روح ٹھونسنے کی شعوری کوشش کی گئی ہو، کیوں کہ آج بھی بسا اوقات پہلے افسانہ منظر عام پر آتا ہے، پھر اسی افسانے میں ناول کی روح پھونکنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اس طریقہ کار میں افسانہ، ناول بننے سے رہا، چوں چوں کا مربہ بن جاتا ہے۔

جوگندر پال کی کہانی علامتی ہو یا پھر خالص بیانیہ، تفہیم و ترسیل کے لیے حاضر دماغی لازمی ہے۔ تاہم علامت کو برتنے کے لیے ان کا جو خاص طریقہ ہے، وہی طریقہ علامتی کہانیوں کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ آج بھی علامتی انداز میں تخلیق کار ذہنی ترنگ دکھاتے ہوئے، ایسی علامت پیش کرتے ہیں کہ جس کی بنیاد پر کہانی سے، کہانی پن دور ہو جاتا ہے اور کہانی ایک معمہ بن کر رہ جاتی ہے:

''عام طور پر تخلیق کار جب افسانوی ادب سماجی، سیاسی حقائق کو بہت دیر بعد یا علامتی پیرائے یا دور از کار تمثیلیت میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اپنی ہمہ گیر اپیل میں ناکام رہتا ہے۔'' (۸)

ملخص یہ کہ جوگندر پال کی کہانیوں میں فلسفیانہ اساس، رشتوں کی پامالی کے خلاف احتجاج، داستانوی اثرات، واضح علامتی بیان، ارتکاز میں وسیع کینوس کا احساس، صحافتی جھلکیوں اور تجریاتی عناصر کے گہرے عکوس ابھرتے ہیں۔ یہ تمام تر خصوصیتیں، جہاں انھیں متقدمین سے ممتاز بناتی

PDF Compressor Free Version

ہیں، وہیں معاصرین میں بھی انہیں انفرادیت کی خلعت عطا کرتی ہیں۔

حواشی

(۱) وہاب اشرفی، آگہی کا منظرنامہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۱۹۹۳ء، ص ۱۷۳

(۲) ''جوگیندر پال کے افسانوں کا انتخاب'' کی پشت سے ماخوذ

(۳) جوگندر پال ''کھودو میاں کا مقبرہ'' موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۷۴

(۴) جوگندر پال ''کھودو میاں کا مقبرہ'' کہانی 'کہاں' موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۰۲

(۵) جوگیندر پال کے افسانوں کا انتخاب، کہانی 'بے گور' تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۵۵

(۶) جوگندر پال ''کھودو میاں کا مقبرہ''، کہانی 'کہاں' موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۹۴ء، ص ۱۰۲

(۷) جوگیندر پال، رابطہ، تخلیق کار پبلشرز نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۶۴

(۸) دیویندر اسر مضمون نگار، مشمولہ: نیا اردو افسانہ، انتخاب، تجزیے اور مباحث، اردو اکادمی دہلی (طبع چہارم) ۲۰۱۰ء، ص ۴۱۴

❁❁❁

عہد ساز افسانہ نگار: جوگندر پال (ص ۱۹ سے آگے)

ہے، وہ لکھتے ہیں:

''جوگندر پال بلاشبہ اپنے عہد کے ایک ایسے جیالے اور پختہ کار افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنی لازوال تخلیقات سے اُردو افسانے اور ادب کو مالا مال کیا ہے۔'' (۸)

جوگندر پال آزادی کے بعد کے ایسے نامور افسانہ نگار ہیں جو اپنی فکری وفنی انفرادیت کی بنا پر اپنے معاصرین میں ممتاز مقام رکھتے ہیں اور اپنے منفرد اسلوب، موزوں تکنیک، دلکش اندازِ بیان اور استفہامیہ طرزِ اظہار کی وجہ سے واضح شناخت کے مالک ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوی فن سے اپنے معاصرین کے مقابلے میں سب سے زیادہ اہل ادب کو متاثر کیا ہے اور بعد کے افسانہ نگاروں پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس اعتبار سے انھیں اگر عہد ساز افسانہ نگار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

حواشی

(۱) مرزا حامد بیگ، اُردو افسانے کی روایت، ناشر، عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء، ص: ۱۰۲۵

(۲) وہاب اشرفی، جوگندر پال فن اور شخصیت، مشمولہ، جوگندر پال: ذکر، فکر، فن، مرتب، ارتضیٰ کریم، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵۸

(۳) جوگندر پال، افسانہ بو، مشمولہ، نمائندہ اُردو افسانے، مرتب، پروفیسر قمر رئیس، اُردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۸۰

(۴) جوگندر پال، افسانہ رسائی، مشمولہ، افسانوی مجموعہ رسائی، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۶۹ء، ص ۱۹۰

(۵) افسانہ رسائی مشمولہ افسانوی مجموعہ رسائی، ص ۱۸۹

(۶) وزیر آغا، جوگندر پال کا فن، مشمولہ، جوگندر پال، ذکر، فکر، فن، ص ۴۴

(۷) پروفیسر قمر رئیس، جوگندر پال کا فنی اسلوب، مشمولہ، آج کل، جوگندر پال نمبر، نئی دہلی، جنوری، ۱۹۹۷ء، ص ۲۸

(۸) م۔م۔ راجندر، جوگندر پال: ایک مطالعہ، مشمولہ، ماہنامہ پروازِ ادب، پنجاب، گوشہ جوگندر پال، جلد ۱۶، شمارہ ۹-۱۲، ستمبر، دسمبر، ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۹

❁❁❁

ضروری اطلاع

زبان و ادب کی خریداری کے لئے آپ زرسالانہ سوروپے براہ راست اردو اکادمی کے اکاؤنٹ میں بھی ڈال سکتے ہیں، لیکن رقم بھیجنے کی جانکاری کے ساتھ ہی اپنا مکمل پتہ اور موبائل نمبر اکادمی کو ضرور بھیج دیں۔

Bihar Urdu Academy

Bank of India, Chauhatta, Patna 800004

SB A/c No. 440810100006014

IFSC Code- BKID0004408

PDF Compressor Free Version

مقالات

ڈاکٹر نریش

169, Sector 17, Panchkola 134109

کرشن چندر: کچھ یادیں کچھ باتیں

کرشن چندر عمر میں مجھ سے بڑے تھے، لیکن ہمارے تعلقات انتہائی دوستانہ تھے۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری ہی ان کی خوبی تھی اور وہ یہ کہ وہ نہ کسی سے الجھتے تھے، نہ کسی سے بگاڑتے تھے۔

رجنی پٹیل کے اصرار پر اور اندرا گاندھی سے ملاقات کے لالچ میں کرشن چندر نے کانگریس کے منڈیسیشن میں شریک ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ انہوں نے خط لکھ کر مجھ سے کہا کہ اگر آپ کے گھر میں انگلش ٹایلٹ ہو تو میں آپ ہی کے پاس ٹھہروں گا، لیکن اگر آپ کے گھر میں انڈین ٹایلٹ ہو تو میرے لئے کسی گیسٹ ہاؤس میں کمرہ بک کرادیں۔ میرے گھر میں انڈین ٹایلٹ تھا، اس لئے میں نے ایک پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس میں ان کے لئے کمرہ بک کرادیا۔ وہ ہوائی اڈے سے سیدھے میرے گھر پر آئے۔ ناشتے کے بعد میں نے ان کو گیسٹ ہاؤس پہنچا دیا۔ ابھی دو گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ کال بیل کھنکی۔ میں نے دروازہ کھولا، تھکے ہارے ہوئے کرشن چندر کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا: ''کیا ہوا؟'' بولے:

''مجھے رجنی پٹیل کی باتوں میں نہیں آنا چاہئے تھا۔ اپنی جیسی بے قدری آج دیکھی ہے، زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔''

ظاہر ہے کہ سیاست کے ''رام لیلا میدان'' میں جہاں اندرا گاندھی کو اپنا چہرہ دکھانے کے لئے نیتاؤں اور پارٹی ورکرز کی حالت ''عورت پہ مرد، مرد پہ عورت سوار تھی'' والی ہو، وہاں کرشن چندر جیسے افسانہ نگار کو پوچھنے والا کون تھا۔

شاید ۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ میں بمبئی میں تھا، کرشن چندر نے مجھے کھانے پر بلایا۔ ہلکی پھلکی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران سلمیٰ بھابھی نے پوچھا: ''کل رات آپ ساحر لدھیانوی کے مہمان تھے نا؟''

میں نے کہا: ''آپ نجومی کب سے ہوگئیں۔'' بولیں:

''نجومی ہونے کی ضرورت نہیں پڑی، آپ نے خود کل رات مجھے بتایا تھا۔''

''میں نے؟''

''جی ہاں! آپ نے۔ رات کو بارہ بجے آپ کا فون آیا۔ آپ نے پوچھا کرشن چندر ہیں کیا؟ میں نے کہا، وہ تو سوگئے۔ آپ نے کہا، اتنی جلدی سوگئے؟ گویا آپ کی نظر میں رات کے بارہ بجے کا وقت سونے کا وقت نہیں ہے۔''

''مگر اس سے ساحر کا کیا تعلق ہے؟'' کرشن چندر بولے۔

''آپ کی آواز نے سلمیٰ کو بتا دیا ہوگا کہ آپ نے کتنی پی رکھی ہے۔ ساحر کو یہ بیماری ہے کہ خود کم پیتا ہے، مہمان کو آؤٹ کر دیتا ہے۔''

ہنسی کا وہ فوارہ چھوٹا کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

۱۹۷۳ء میں ہم نے لکھنؤ میں کل ہند غیر مسلم مصنفین کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ کرشن چندر کو صدر منتخب کیا گیا۔ کانفرنس سے ایک روز قبل نامہ نگاروں سے ملنا تھا۔ کرشن چندر، ساحر لدھیانوی، رام لعل، جگن ناتھ آزاد اور مجھ کو بات کرنی تھی۔ جن سنگھ کے اخبار ''مدر لینڈ'' کے نامہ نگار نے پوچھا کہ یہ کانفرنس ایسے وقت پر کیوں منعقد کی جارہی ہے جب کہ عام انتخابات قریب ہیں؟ اس کا مقصد اردو کے نام پر برسر اقتدار پارٹی کو مسلم ووٹ دلوانا تو نہیں ہے؟

ساحر تو یہ کہہ کر دامن جھاڑ گئے کہ میں تو اس کانفرنس میں بطور آبزرور شریک ہو رہا ہوں۔ کرشن چندر گھبرا گئے۔ مجھ سے بولے:

''دیجئے ان کے سوال کا جواب۔'' میں نے کہا:

''صاحب! اس معاملے میں میرا ذہن بہت صاف ہے۔

PDF Compressor Free Version

ہمارا سیاسی مقصد بھی ہے اور وہ یہ کہ اس ملک میں اردو کو اس کا حق دلانے کے لئے سیاسی دباؤ بنانا ضروری ہے۔ ابھی حال ہی میں اندرا جی نے کہا ہے کہ اردو اگر صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے تو باقی لوگ کہتے کیوں نہیں کہ یہ ان کی زبان ہے۔ ہم غیر مسلم مصنفین بہت بڑی تعداد میں جمع ہو کر اندرا جی کو بتانا چاہتے ہیں کہ اردو اپنے شیدائیوں کا ماتھا چومتے وقت یہ نہیں دیکھتی کہ اس پر تلک کا نشان ہے یا سجدے کا۔"

پریس کانفرنس ختم ہوئی تو کرشن چندر مجھ پر بگڑ گئے:

"یہ آپ نے کیا کہہ دیا؟" میں نے کہا: "گھبرایئے نہیں، بیان میرے نام سے شائع ہوگا، آپ کے نام سے نہیں۔" لیکن کرشن چندر تب تک پریشان رہے جب تک انہوں نے صبح کے اخبارات دیکھ کر تسلی نہیں کر لی کہ بیان میرے ہی نام سے شائع ہوا ہے۔

کل ہند غیر مسلم مصنفین کانفرنس کو فرقہ واریت کی نظر سے نہ دیکھا جائے، اس مقصد سے ہم نے مسلم ادیبوں کی بڑی تعداد کو بطور آبزرور کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ کیفی اعظمی، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، آل احمد سرور، ظ۔ انصاری، محمود الٰہی سمیت بڑی تعداد میں مسلم ادیب شامل بھی ہوئے۔

کانفرنس سے ایک روز پہلے شام کے وقت ہوٹل میں بیٹھے ہوئے میں نے کرشن چندر سے کہا:

"کرشن جی، معاف کیجئے، آپ کانفرنس میں بطور آبزرور شامل ہوں گے۔" کرشن چندر نے حیران ہو کر پوچھا:

"وہ کیوں؟" میں نے کہا:

"وہ اس لئے کہ اللہ رکھا غیر مسلم نہیں ہے۔"

کرشن چندر کا رنگ ہی اُڑ گیا، لیکن جلدی ہی خود کو سنبھالتے ہوئے انہوں نے پوچھا: "سنئے، اس کانفرنس میں آپ کے علاوہ اور کس کس کو اس بات کا علم ہے؟" میں نے کہا:

"ہو سکتا ہے سب ہی کو معلوم ہو۔" بولے:

"سنو ڈاکٹر، تمہارے علاوہ کسی کو نہیں پتہ، یہ مجھے معلوم ہے۔ خدا کے لئے اس بات پر پردہ ہی پڑا رہنے دو۔ میں اندرا گاندھی کو خط لکھ کر آیا ہوں کہ میں غیر مسلم مصنفین کانفرنس میں جا رہا ہوں۔"

میں نے ان کو وسوسے سے نجات دلاتے ہوئے انہیں کی زبان میں کہا: "چلئے نہیں بتائیں گے، مگر اس کا عوضانہ؟" کاروباری کرشن چندر نے فوراً وعدے کا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

"تمہارے بمبئی آنے پر سن اینڈ سینڈ میں شاندار ڈنر۔"

بہت ہی کم لوگوں کو معلوم تھا کہ اپنی پہلی بیوی کے رہتے کرشن چندر نے مشہور افسانہ نگار سلمٰی صدیقی کے ساتھ شادی کرنے کے لئے اسلام قبول کر لیا تھا۔ تبدیلی مذہب کے وقت ان کا نام "اللہ رکھا" رکھا گیا تھا۔ کرشن چندر جب زینہ چڑھتے اُترتے وقت سلمٰی بھابھی سے کہتے تھے "سلمٰی سنبھال کے" تو سمجھ میں آجاتا تھا کہ کرشن چندر کو چڑھ گئی ہے۔

۱۹۶۸ء میں میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں، میں نے اردو کے بھارتیہ کرن پر زور دیا تھا۔ اس پر اردو اخبارات اور رسائل نے میرے خلاف مورچہ کھول دیا تھا۔ ایک شام کو میں کرشن چندر کے گھر پر تھا تو سلمٰی بھابھی نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے میری دلیلوں سے اتفاق ظاہر کر دیا۔ دیر تک یہ گفتگو جاری رہی، مگر کرشن چندر منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھے رہے۔ نہ اتفاق، نہ اختلاف۔ میں نے پوچھا:

"اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔" تو بولے:

"اس موضوع پر سلمٰی سے آپ کی گفتگو ہو رہی ہے اور میں بغور سن رہا ہوں۔"

لوگ سمجھتے تھے کہ کرشن چندر بہت امیر آدمی ہیں۔ بمبئی میں رہتے ہیں، درجنوں کتابیں شائع کر چکے ہیں، فلموں کے لئے لکھتے ہیں، موٹا پیسہ کماتے ہوں گے، مگر مجھے اس وقت قطعی حیرت نہیں ہوئی جب اپنے بھائی افسانہ نگار اور فلم ساز مہندر ناتھ کی رحلت کے بعد انہوں نے مجھے لکھا:

"مہندر ناتھ پندرہ ہزار کا قرض چھوڑ گیا ہے، جسے میں دھیرے دھیرے دو سال میں ادا کر دوں گا۔"

انہوں نے مہندر ناتھ یادگار کمیٹی بھی بنائی تا کہ مہندر ناتھ کے بیوی بچوں کے لئے چندہ جمع کیا جا سکے۔ بینک میں کمیٹی کا الگ سے اکاؤنٹ کھولا گیا، مگر یہاں بھی انہیں کچھ خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر محسن رضا رضوی

Assistant Professor, Deptt. of Urdu, Oriental College

Patna City 800008 (Mob. 9431443778)

شہزاد معصومی کا شعری امتیاز

شہزاد معصومی (۱۹۸۰ء-۱۹۲۹ء) کے اجتماعی لاشعور میں تصوف اور ادب گھلا ہوا ہے۔ ان کا سلسلہ نسب علی نگر پالی کے اس سادات خانوادے سے جاملتا ہے جہاں تفسیر، فقہ، تصوف، ادب اور حب الوطنی کے روشن مینارے نظر آتے ہیں۔ میر معصوم ان کے مورث اعلیٰ تھے۔ سرزمین پالی پر سب سے پہلا قدم انہیں بزرگ کا پڑا تھا۔ یہ بزرگ ضلع پٹنہ کے ایک موضوع مسیانواں کی آبادی سے کنارہ کش ہوکر عبادت و ریاضت کی غرض سے اول اول اس سرزمین پر وارد ہوئے۔ یہ زمین نہایت پرفضا اور سرسبز و شاداب تھی اور یہاں عبادت میں مشغول رہنے کے مواقع بیش از بیش تھے۔ میر معصوم کی آمد کے بعد ان کے خانوادے کے دیگر افراد بھی دھیرے دھیرے یہاں آکر سکونت پذیر ہونے لگے اور رفتہ رفتہ یہ جگہ آباد ہوگئی۔ جناب شہزاد معصومی کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت میں انہیں میر معصوم سے ملتا ہے اور انہیں کی مناسبت سے شہزاد معصومی اور ان کے خانوادے کے دیگر افراد اپنے نام کے ساتھ ''معصومی'' کا لاحقہ استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں خود ان کا بیان دیکھئے:

> ''میرے والد محترم سید آل حسن معصومی مرحوم ابن سید منیر حسن مرحوم اپنے مورث اعلیٰ میر معصوم کا نام اپنی نسل میں زندہ و برقرار رکھنے کے لئے اپنے نام کے آگے معصومی لکھتے تھے۔ جس کی پیروی ہمارے یہاں رائج ہے۔'' (معرکہ تیغ وقلم، ۱۹۹۷ء، ص ۲۴۳)

میر معصوم علی کی پانچویں پشت میں ایک صوفی شاعر اور مرد خدا شناس میر چراغ علی گزرے ہیں، جن کی پیدائش ۱۸۰۰ء میں علی نگر پالی میں ہوئی۔ چراغ علی کو فارسی اور اردو زبان پر قدرت حاصل تھی اور دونوں زبانوں میں اشعار موزوں کرتے تھے۔ ''چراغ'' تخلص فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ مقامی مگہی زبان میں بھی نہایت اچھے شعر کہتے تھے۔ اس میں ''چولہن'' تخلص استعمال کرتے تھے۔

ان کی ایک طویل مثنوی کے چند اشعار ناصر زیدی نے شہزاد معصومی کے شعری مجموعہ ''شعلہ تشنگی'' (۱۹۸۰ء) کا تعارف لکھتے ہوئے نقل فرمائے ہیں۔ اسی حوالے سے چند اشعار یہاں پیش کر رہا ہوں۔

مری مشکل بھلا حل ہووے کیوں کر
کریں اب دست گیری شاہ حیدر
مجھ اوپر سخت ہے مشکل گراں بار
کیا افلاس نے مجھ کو گرفتار
سلامت رکھ مرا ایمان یارب
مرا شاداب رکھ بستان یارب
اطاعت کچھ بجا لایا نہ تیری
کٹی جاتی ہے ساری عمر میری
کیا نیکی نہیں دنیا میں حاصل
مجھے ڈر رات دن رہتا ہے کامل
مجھے اندیشہ اعمال بد ہے
یہی بس خوف دل میں لاتعد ہے
قیامت میں کھڑی میزان جب ہو
مری مشکل وہاں آسان سب ہو
دعا مری پذیرہ کر خدایا
تیری درگاہ میں سائل ہے بندہ

PDF Compressor Free Version

نہ رکھ محروم اپنے آستاں سے
گل رحمت عنایت بوستاں سے

میر چراغ علی کے فرزند سید منیر حسن تھے۔ سید منیر حسن کے دو فرزند سید آل حسن اور سید فصیح احمد نیز ایک دختر وحید النساتھیں۔ شہزاد معصومی سید آل حسن معصومی کے فرزند تھے۔ آل حسن معصومی بھی شعروادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے، شاعری کے علاوہ انہیں نثر نگاری سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کا شمار بہار کے دور اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا ایک طویل افسانہ ''کشتہ انفعال'' ہے، جو ''عبرت کے دو آنسو'' کے نام سے بھی معروف ہے۔ یہ طویل افسانہ یا ناولٹ ۵ ستمبر ۱۹۳۰ء کو رحمانی پریس، مہندرو سے شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی مزید دو کتابوں کا پتہ ملتا ہے۔ ان کے نام ''معصومی کی اردو جغرافیہ ہند'' اور ''اردو اسینشیل'' (Urdu Essentail) ہیں۔ ان کے یہ اشعار ایک خاص حلقے میں آج بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ۔

آج پہلو میں میرے کل اس کے
ایسی دنیا سے دل لگائیں کیا
سن چکے جس کو تم ہزاروں بار
پھر وہی داستاں سنائیں کیا
تونے تو میرے جرم و گنہ گن کے رکھ دیئے
کچھ تیری رحمتوں کا بھی یارب حساب ہے
میں جی جاؤں اجل سے آپ آجائیں اگر پہلے
یہی پیغام کہنا یار سے اے نامہ بر پہلے

اس طرح مندرجہ بالا پس منظر میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ شہزاد معصومی کی ذہنی تشکیل میں تصوف، ادب، فلسفہ اور حب وطن کا ایسا امتزاج موجود تھا جو شعور کے ارتقا کے ساتھ ساتھ شگفتہ و شاداب ہوتا گیا۔ شاعری انہیں وراثت میں ملی۔ ان کے شعری سرمائے پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ مختلف اصناف سخن پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ غزل، نظم، رباعی، قطعہ، قصیدہ اور مرثیہ گوئی وغیرہ کے ساتھ ساتھ طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے جو نمونے ان کے یہاں ملتے ہیں وہ اپنے اعلیٰ معیار کی وجہ سے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض شعرا غزل پر تو دسترس رکھتے ہیں، لیکن نظم نگاری یا دیگر اصناف میں ان کا تخلیقی جوہر کمزور دکھائی دیتا ہے۔ شہزاد معصومی کے یہاں ہر جگہ ایک طاقتور اور توانا اظہار و بیان کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے شعری مجموعے ''شعلہ تشنگی'' (۱۹۸۰ء) میں نظموں کے مقابلے میں غزلوں کی تعداد کم بھی ہے اور ترتیب میں بھی غزلوں سے پہلے نظمیں رکھی گئی ہیں۔ اس ترتیب سے یہ احساس ہوتا ہے کہ شہزاد معصومی غیر معمولی قوت بیان کی وجہ سے نظم نگاری کی طرف زیادہ متوجہ تھے۔

نظم کی ہیئت اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ کسی مخصوص موضوع کو تفصیل اور تسلسل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ یہ کام ہر شاعر سے نہیں ہوسکتا۔ عام طور پر غزلیہ شاعری زندگی کے منتشر، لیکن حسی اعتبار سے نہایت اہم تجربات پر مرکوز رہتی ہے۔ غزل میں تفصیل کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہاں اشارے اور کنائے سے کام لیا جاتا ہے۔ صراحت اور وضاحت جو شہزاد معصومی کی شعری شخصیت کا خاصہ ہے، ظاہر ہے اس کا مظاہرہ نظموں میں ہی ممکن تھا۔ چنانچہ شہزاد معصومی نے متنوع موضوعات کے تحت نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان نظموں میں کہیں مشاہدہ ہے، کہیں پیغام، کہیں ترقی پسندانہ ذہن کی غمازی ہے، کہیں رومانی فکر ہے تو کہیں انقلاب آفریں لہجہ، کہیں فطرت کی عکاسی ہے تو کہیں سماجی مسائل کی پیشکش۔ اس طرح نظموں میں موضوعات کے تنوع نے شہزاد معصومی کے اس ذہن کو اچھی طرح منعکس کیا ہے جس کے تحت ان کی شخصیت میں اضطراب اور تلاش کی خصوصیات ملتی ہیں۔

شہزاد معصومی کی نظموں سے گہری وابستگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ فطری طور ان کے مزاج میں تنوع تھا۔ کسی ایک طریقے اور بندھے بندھائے اصول یا فارمولے کے پابند ہوکر رہ جانا ان کی فطرت کے منافی تھا۔ نظم میں چوں کہ ہیئتی تجربوں کی زیادہ گنجائش ہوتی ہے اس لئے یہ صنف ان کے مزاج کو زیادہ راس آتی ہے۔ شہزاد معصومی اگر ایک طرف اپنی نظموں میں عالمی سطح پر اثر انداز ہونے والے فلسفہ حیات سے اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو دوسری طرف اردگرد رونما ہونے والے واقعات بھی ان کی شاعری کا موضوع بنے ہیں۔ مثلاً آزادی کے حصول کے بعد اہل وطن کی مایوسی اور تشنگی، آپسی منافرت، فرقہ پرستی کا طوفان، اہل اقتدار کے ذریعہ ہونے والے استحصال اور اس طرح کے

PDF Compressor Free Version

دیگر موضوعات اور مسائل نہایت خوبصورتی کے ساتھ ان کے یہاں شعری پیکر میں سما جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں ''اے جوانانِ وطن''، ''۴۷-۱۹۴۶ء'' اور ''پنچھی ایک قیدی سے'' ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ ذیل میں چند مثالیں دیکھئے اور ان کے شعری تیور کا اندازہ لگائیے۔

تم نے جس عزم سے زنجیر غلامی توڑی
وہ ارادے کہ جواں جن سے ہر اک قوت تھی
حوصلے جن کی قدم بوسی میں رہتی تھی بہار
ولولے جن سے تھا چڑھتے ہوئے دریا کو فشار
کیا ہوئی شورش جذبات جنوں اے ہمدم
گرمی شوق کی کیوں نبض پڑی ہے مدھم
شکوہ وقت کرد یہ نہیں زیبا دیتا
اپنے ہی دست ہوس کار نے تم کو مارا
تم نے تاراج کیا خود ہی گلستان وطن
ایک بیوہ کی طرح لگتی ہے لیلائے چمن

(اے جوانان وطن)

دیکھ حسرت سے نہ یوں تو مری آزادی کو
میری آزادی کے پیچھے ہے پڑی صیادی
زندگی میری ہے اک جہد مسلسل اے دوست
غم ہستی کی اسیری میں بھلا کیا شادی

آج انساں درندوں سے بھی بدتر کیوں ہے؟
کیا ہوئی وارث آدم کی شرافت اے دوست؟
اشرف الخلق یہ مخلوق بھلا کیسے ہے؟
دل میں جس کے نہ حمیت نہ مروت اے دوست

(پنچھی ایک قیدی سے)

شہزاد معصومی کی نظم نگاری کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے منظر نگاری اور ماحول کی خوبصورت متحرک تصویریں بڑی کامیابی کے ساتھ اُتاری ہیں۔ جب وہ منظر نگاری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کے اظہار و بیان میں ایک مخصوص روانی کا اندازہ ہوتا ہے، ایسی روانی جس میں اظہار کی رفعت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ایسے کئی مقامات ہیں جہاں ان کی منظر نگاری پر جوش کے لہجے کا گمان گزرنے لگتا ہے۔ مثلاً نظم ''سال نو'' کے ان اشعار پر غور کیجئے۔

جاگی یوں حسرت دل آمد سال نو پر
جیسے تاریک شبستاں میں سحر کا ہو گزر
جیسے کھل جائے اچانک مئے باب امکاں
جیسے ہو جائے کسی لوہے کی دیوار میں در
جیسے گم گشتہ مسافر گھنی تاریکی میں
دور سے دیکھ لے اک شمع سر راہ گزر
جیسے منہ پر کسی بیمار کے رونق آجائے
سن کے اپنے کسی محبوب کے آنے کی خبر

کتنی خوابیدہ تمناؤں نے انگڑائی لی
یوں ہی ہر سال ہر اک آمد سال نو پر

سالہا سال سے ہے ایک ہی مرکز پہ حیات
ایک ہی حال میں ہیں روز و شب و شام و سحر
نہ ترقی، نہ تنزل، نہ فراغت، نہ جمود
نہ تجلی، نہ اندھیرا، نہ تماشا، نہ نظر
کاش یہ سال رواں یعنی سن انسٹھ اے دوست
پچھلے انداز روایات سے چلتا ہٹ کر

شہزاد معصومی کی تخلیقی شخصیت اپنے موضوعات سے ناگزیر طور پر وابستہ رہتی ہے۔ اچھی شاعری کے نمونے اسی وقت وجود میں آسکتے ہیں جب اظہار و بیان پر مکمل دسترس کے ساتھ، فنکار کا موضوع سے اٹوٹ جذباتی تعلق بھی ہو۔ شہزاد معصومی کی نظموں میں عام طور پر اس رابطے کا احساس ہوتا ہے۔ شہزاد معصومی کی نظموں کے جمالیاتی پیکر اور ان کی ماحول آفرینی و منظر نگاری کے ذیل میں اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ان کے یہاں منظر کی پیش کش برائے تفنن نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے ان کا بالیدہ سماجی شعور کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں بعض نظمیں ہمارے مشاہیر ادب اور قومی رہنماؤں سے متعلق بھی ملتی ہیں۔ جیسے غالب، تہجور

PDF Compressor Free Version

شمسی، یاد مجاز، نذر جگر، محمد علی جوہر، مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو وغیرہ۔ یہاں ان نظموں سے مثالیں پیش کرنا یا ان کا محاکمہ مقصود نہیں ہے۔ البتہ یہ بات ضرور عرض کرنے کی ہے کہ شہزاد معصومی کی بعض نظموں میں جہاں جوشؔ کی سی قادر الکلامی کا احساس ہوتا ہے وہیں ان کی چند نظمیں اخترؔ شیرانی کی بھی یاد دلاتی ہیں، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اخترؔ رومان کی فضا میں سرشار ہو جاتے ہیں اور سرمستی و بے خودی ان کی تخلیق کا مدعا بن جاتی ہے، جب کہ شہزادؔ معصومی کے یہاں تمام تر رومانی اظہار و تاثرات کے باوجود زیریں سطح پر انقلابی لے کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ان معنوں میں جہاں ایک طرف وہ اختر شیرانی کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں وہیں دوسری طرف ان کا اپنا لہجہ بھی صاف اور نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اس سلسلے کی نظموں میں ''عذرا''، ''حوا''، ''کسی کا حسن''، ''نین کسی کے'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں ''عذرا'' اور ''حوا'' سے چند اشعار پیش کر رہا ہوں۔

رہ طلب میں بغیر تیرے یہ زندگی کوئی زندگی ہے
ہر اک رستہ سپاٹ سا ہے، ہر ایک منزل اداس سی ہے
چراغ ارمان و آرزو کے، بغیر تیرے بجھے بجھے ہیں
جو تیرا جلوہ نہیں میسر تو سر بہ سر دل میں تیرگی ہے

ہلال کو دیکھ کر فلک پر یہ مجھ کو اکثر گمان گزرا
کہ تیری چشم غزال شاید افق سے مجھ کو بلا رہی ہے

یہی ہے شہزادؔ دل کی حسرت کہ اپنی عذرا کو ساتھ لے کر
بساتے دنیائے ماہ و انجم کسی سے جو بس نہیں سکی ہے

(عذرا)

مرے نغمے ہیں خالق زندگی کی آرزوؤں کے
مری محبوب لیکن تو مرے نغموں کی خالق ہے
تجھی سے سوز و ساز و کیف و مستی ہے سرِ ہستی
کبھی ہے مرہم دل اور کبھی زخموں کی خالق ہے
مرے احساس کی خالق مرے جذبوں کی خالق ہے
مری غزلوں کی خالق ہے مری نظموں کی خالق ہے

فقط اک دل نوازی زیست کا مقصد نہیں تیری
تو کشت نوع انساں ہے بہار باغ عالم ہے
رفیق و ہم سفر ہے راہ ہستی کی مسافت میں
ترا پروردۂ آغوش اک اک ابن آدم ہے
تو تہذیب و تمدن کی حسیں قدروں کی خالق ہے
مری غزلوں کی خالق ہے، مری نظموں کی خالق ہے

(حوا)

نظم ''آدمی اور سمندر'' شہزادؔ معصومی کے فکر و نظر کی بلندی کا احساس دلاتی ہے۔ اس کے ہر مصرع میں شاعر کا مفکرانہ ذہن اپنے قاری کو تخیل کی نئی دنیاؤں کی سیر کراتا ہے۔ اس نظم کا صرف ایک بند دیکھئے۔

آدمی کی ہے طبیعت کہ سمندر کا مزاج
جلتے لیتی ہوئی جذبات کی موجیں ہیں کبھی
ہے کبھی اس میں جو طوفان کی شوریدہ سری
ہلکی ہلکی مدھر احساس کی لہریں ہیں کبھی
ایک ہلچل سی کبھی ہے تو ہے خاموشی کبھی
اور گریہ بھی نہیں ہے تو ہے سرگوشی کبھی

شہزاد معصومی کی نظمیں ان کا بہترین شناخت نامہ ہیں۔ ''انقلاب میخانہ''، ''آدم عصر حاضر''، ''حسرت شمع'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن سے ان کے لہجے اور تیور کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور نظم نگاری کے میدان میں ان کے مقام کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

شہزادؔ معصومی ایک ہشت پہل تخلیقی شخصیت کا نام ہے۔ ان کی زنبیل فن میں بیک وقت غزل، نظم، قطعات، رباعیات اور مراثی کے خوبصورت فنی نمونے ملتے ہیں۔ اس ہشت پہل شخصیت کے متعدد اصناف کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ان کے مجموعی کارناموں میں ان کے مراثی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا فنی جائزہ ایک الگ مطالعے کا متقاضی ہے۔ ❁❁

☆ عید تو اسی کی ہے جس کے روزے خدا قبول کرلے۔
☆ سب سے بڑا گناہ وہ ہے جسے گنہ گار معمولی سمجھے۔

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر رضوان احمد اعجازی

''اعجازی ہاؤس'' ڈاکٹر اعجازی مارگ، مظفر پور 842001 (Mob.9939443799)

کلام اقبالؔ میں عورت

علامہ اقبالؔ کا نام نہ صرف اردو اور مشرقی شاعری میں، بلکہ عالمی شاعری میں بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اپنے وقت کے ایک عظیم المرتبت فلسفی، قادر الکلام شاعر، ہمدرد سیاست داں، بالغ نظر حکیم اور انقلابی مصلح قوم گزرے ہیں۔ علامہ اقبالؔ، جیسا کہ سبھی جانتے ہیں ادب برائے زندگی کے نظریے کے علمبردار تھے اور شاعری کے توسط سے بہر صورت زندگی کے تعمیری، اصلاحی، انسانی، مفید اور انقلابی پہلوؤں کو سامنے لانا وہ اپنی بنیادی ذمہ داری سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بہت سارے متنوع موضوعات کے دوش بدوش نسائیات کو بھی ایک خاص وزن و وقار اور شعور و ادراک کے ساتھ جگہ ملتی رہی رہے۔

علامہ اقبالؔ نہ صرف اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ عورت کی ترقی یا تنزلی پر ہی کسی قوم کی ترقی و تنزلی کا انحصار ہے بلکہ ان کے ذہن و فکر میں اس ترقی و تنزلی کا حقیقی نقشہ بھی پوری طرح واضح تھا اور وہ اس بات پر پورا یقین رکھتے تھے کہ عورتوں کے باب میں اسلامی تعلیمات کی اشاعت اور اس پر عمل آوری ہی اصلاً راہ نجات و فلاح ہے اور بنت رسول سیدہ فاطمہ زہرا کی شخصیت اور ان کا کردار ہی طبقہ نسواں کے لئے اسوۂ کاملہ کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے انہوں نے متنوع عصری و مغربی افکار و نظریات کے تناظر میں، نہایت شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔

کلام اقبالؔ کے بالاستیعاب مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ انہوں نے اپنی فارسی اور اردو شاعری میں، اگرچہ کمیت کے لحاظ سے نسائیات کے موضوع کو نسبتاً کم اٹھایا ہے، لیکن کیفیت کے لحاظ سے اسے پوری دانشورانہ جامعیت کے ساتھ سامنے لادیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے نوعی حیثیت سے اپنے کلام میں عورت کے مراتب و اثرات دکھایا ہے اور صاف لفظوں میں بتایا ہے کہ ''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ'' بلکہ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ عورت کے وجود سے ہی کائنات میں رونق اور اسی کے ساز سے زندگی کا سوز دروں قائم ہے۔ عورت کی مشت خاک اپنے مجد و شرف میں ثریا سے بڑھ کر ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ ہر شرف و مجد اسی درج کا دُرِ مکنون ہے۔

یہاں علامہ اقبالؔ کے جن اشعار سے غذا لی جارہی ہے وہ مشہور و معروف ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی بات نہایت تہدار استعارے کی زبان میں پڑھنے والوں تک پہونچائی ہے۔ بیشک ایک ایسے زمانے اور ایک ایسے فکری ماحول میں جب کہ عورت کی عزت و شرافت اور اس کے وقار و اعتبار پر ان گنت سوالیہ نشان لگائے جارہے تھے، اس کی عظمتوں کا یوں برملا اظہار و اعتراف فکر و پیام کے لحاظ سے اردو شاعری کی ایک عظیم جست کے مصداق ہی کہا جائے گا اور اس کا مفہوم بالکل روشن ہے کہ اقبالؔ کی نظر میں شرف و بزرگی کی کوئی اساس، وجود زن کی نسبتوں سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔

اقبالؔ عورت کے حسن اور اس کی فطری نزاکتوں سے بخوبی آشنا ہیں، لیکن وہ اس مشت خاک کی بلند و بالا پرواز بھی دیکھنا اور دکھانا نہیں بھولتے ہیں، انہیں اس بات سے انکار نہیں کہ عورت ''مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی، لیکن'' وہ اس بات کا بھی اعتراف رکھتے ہیں اور احساس دلانا چاہتے ہیں کہ ''شرار افلاطوں'' اسی کے شعلہ سے ٹوٹا ہے۔ اس طرح در پردہ اقبالؔ نے عورت کی ذہنی و فکری اور فطری قوت دکھانا چاہا ہے اور عورت کو کمزور سمجھنے والے طلسمی اثرات سے مردوں کو ہوشیار کیا ہے اور صاف لفظوں میں بتایا ہے کہ لذت تخلیق سے عورت کا وجود

PDF Compressor Free Version

آتشیں ہے اور یہ کیفیت اس کے مرتبے کی دلیل ہے۔ ''امومت'' کا درجہ بہمہ صورت عورت ہی کے لئے ہے اور یہی وہ مرکزی نقطہ خیال ہے جسے اقبال نے اپنے کلام میں نہایت فلسفیانہ انداز سے پیش کیا ہے۔

''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' علامہ اقبال کی ایک شہرہ آفاق نظم ہے، جسے یوں تو ایک تاثراتی اور تعزیتی نظم کہا جا سکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نظم کے توسط سے بحیثیت ''ماں'' عورت کی ممنونیت اور اس کی ہمہ جہت عظمتوں کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، وہ یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ عورت کی زندگی دفتر ہستی کا زریں ورق ہے اور زمانے میں گھر اور خاندان کو عزت اور وقار کا سرمایہ عورت ہی کی بدولت ملتا ہے۔ عورت کی دعا، عورت کا انتظار، عورت کا ایثار، عورت کی تربیت اور توجہ غرض کہ سب کچھ اپنی مثال آپ ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری میں عورت کا ذکر مختلف جہتوں سے آیا ہے، مثلاً انہوں نے اپنے ایک فارسی شعر میں لکھا ہے کہ حضرت مریم، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مادرانہ نسبت رکھتی ہیں اور اسی ایک نسبت سے ''عزیز'' ہیں جب کہ حضرت فاطمہ زہرا تین نسبتوں سے عزیز ہیں یعنی وہ رسول محترم کی نور نظر ہیں، حضرت علی کی زوجہ ہیں اور حضرات حسنین کی والدہ مکرمہ۔ اگرچہ اقبال کا یہ بیان منقبت کے ذیل میں ہے، لیکن بالواسطہ طور پر اس سے یہ ذہن ضرور مل جاتا ہے کہ اقبال کی نظر میں عورت کی تینوں حیثیت محترم ہے اور اسے بنت رسول کے حوالے سے دکھا کر دراصل اقبال یہی بتانا چاہتے ہیں کہ ہماری خواتین کو اپنے لئے جس مثالی کردار کا انتخاب کرنا چاہیے وہ بنت رسول کا کردار ہے۔ بیشک فاطمہ، فاطمہ ہیں اور وہی عورتوں کے لئے نمونہ ہیں۔

کلام اقبال میں عورت کا تذکرہ مختلف پہلوؤں سے اور متنوع فکری و ادبی شان و شوکت کے ساتھ ہوا ہے۔ ان کی شاعری رنگا رنگ تلمیحات سے بھری پڑی ہے اور اس میں جہاں انہوں نے مردوں کے نام لئے ہیں وہیں تلمیحی اسمائے اناث کی شمولیت کا اہتمام بھی رکھا ہے۔ مثلاً اقبال کا یہ شعر دیکھئے جس میں ''جلوۂ یوسف'' کے ساتھ ''خون زلیخا'' کا بھی ذکر ہے اور اس انداز سے ہے کہ خون زلیخا کی تپش فراواں کا نہ صرف از خود اعتراف ہو جاتا ہے بلکہ یہ تپش، عمل کے لئے ایک معیار کا کام دیتی ہے اور شاعر کے حسن پیام کا حصہ بن جاتی ہے ۔

جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خون زلیخا کردیں

اقبال نے نہ صرف یہ کہ عربی و قرآنی تلمیحات کے استعمال میں، عورت کے کردار اور اس کے پیامی رنگ کو فراموش نہیں کیا ہے بلکہ ایرانی تلمیحات کا استعمال کرتے ہوئے بھی نسوانی نام یاد رکھے ہیں۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے جس میں ''شیریں'' موجود ہے ۔

وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا بے ستوں بھی، کوہکن بھی ہے

اسی طرح اقبال کے کلام میں ایسے اشعار بھی جا بجا ملتے ہیں جن میں ''لیلیٰ'' کا ذکر آیا ہے اور نہایت مزے کی بات یہ ہے کہ اپنے ان اشعار میں اقبال نے تلمیح و استعارے کی زبان استعمال کرتے ہوئے بہر صورت عورت کی ہمت اور اس کے عزم و حوصلے کے حوالے سے مردوں کو للکارنے اور غیرت دلانے کا فریضہ انجام دیا ہے مثلاً ۔

شور لیلیٰ کو کہ باز آرائش سودا کند
خاک مجنوں را غبار خاطر صحرا کند

(نالۂ فراق)

ترا اے قیس کیوں کر ہو گیا سوز دروں ٹھنڈا
کہ لیلیٰ میں تو ہیں اب تک وہی انداز لیلائی

(تضمین بر شعر اپنی شاملو)

درد لیلیٰ بھی وہی، قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی

(شکوہ)

وہ تو دیوانہ ہے بستی میں رہے یا نہ رہے
یہ ضروری ہے حجاب رخ لیلیٰ نہ رہے

(جواب شکوہ)

پیدا دل ویراں میں پھر شور محشر کر
اس محمل خالی کو پھر شاہد لیلیٰ دے

(دعا)

PDF Compressor Free Version

عزت ہے محبت کی قائم اے قیس حجاب محمل سے
محمل جو گیا عزت بھی گئی، غیرت بھی گئی، لیلیٰ بھی گئی

مل ہی جائے گی کبھی منزل لیلیٰ اقبالؔ
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

(غزلیات)

یہ اشعار زبان حال سے بتا رہے ہیں کہ اقبالؔ کا کلام اردو زبان میں ہو یا فارسی زبان میں اور وہ نظم و غزل اور تضمین غرض کہ کسی صنفی شناخت سے رشتہ مند ہو اور وہ بصورت مطلع ہو یا بصورت مقطع، بہر حال اس میں ''عورت'' کا ذکر نہایت بلیغ اشارے، وسیع منظر و پس منظر اور بامعنی عصری پیام فوز و فلاح کے ساتھ موجود ہے اور یہ کہنے میں کسی پس و پیش کا احساس نہیں ہوتا کہ اقبالؔ نے تمام تر تفکیری شانِ متانت کے ساتھ اپنے کلام میں ''عورت'' کا موضوع اُٹھایا ہے اور اسے اپنے عہد کی مناظراتی عیسائیت تحریک سے بھی بیگانہ نہیں رہنے دیا ہے، بلکہ نہایت علمی انداز سے اس کا تعاقب کیا اور اس کے لئے مسکت جواب مہیا کیا ہے۔

اقبالؔ صنف نازک کے جذبات و کمالات، اس کی تپش دروں اور اس کے فطری و تہذیبی ملتزمات کے قائل ہیں اور اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ عورت کی قدر دانی اور اس کی حفاظت و عزت پر ہی مردوں کے معاشرے کی توقیر کا انحصار ہے۔

زمانہ بیشک بدلتا ہے، لیکن بنیادی فطری اور انسانی و آفاقی قدریں نہیں بدلتی ہیں، اس لئے اقبالؔ اس بات کے خواہاں ہیں کہ عورت کو ہمیشہ اس کے بلند و بالا اوصاف کے حوالے سے ہی یاد رکھنا اور اس سے اپنے لئے ارجمندی کے عناصر کشید کرنا چاہیے۔

اقبالؔ کے مختلف مجموعے اس بات کے گواہ ہیں کہ انہوں نے نہ صرف اپنی شاعری میں نسوانی تلمیحی کرداروں کو ایک خاص انداز اور خاص نظریاتی مقاصد کے لئے حوالہ بنایا ہے بلکہ ان کے یہاں متعدد ایسی نظمیں بھی ہیں جن کا سرنامہ عورت کے نام سے تزئین یافتہ ہے۔ اقبالؔ کی نظم ''سلیمیٰ'' اس کی ایک معروف مثال ہے جس میں انہوں نے اس کردار کو بایں طور پر اپنا خراج پیش کیا ہے ۔

صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر
ہنگامہ جس کے دم سے کاشانہ چمن میں

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ تیری کمال اس کا

ان اشعار کی سادگی اور ان کا رومانی حسن اپنی جگہ، لیکن اس طرح علامہ اقبالؔ نے بہر صورت عورت کی صلاحیت و لیاقت اور اس کے گوناگوں اثرات کا جس انداز سے اعتراف کیا ہے اور اس کا جس شدت سے احساس دلایا ہے، وہ ناقابل فراموش ہے۔ اسی طرح اقبالؔ کی ایک اور نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' سامنے آتی ہے۔ یہ نظم اس نسوانی کردار کو خراج عقیدت ہے جس نے طرابلس کی لڑائی میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہادت پائی تھی۔ اقبالؔ کہتے ہیں ۔

فاطمہ تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت طور صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیان دیں کی سقائی تیری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوق شہادت کس قدر
فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمہ عشرت بھی اپنے نالہ ماتم میں ہے

یہ اشعار زبان حال سے بتا رہے ہیں کہ اقبالؔ کی نظر میں عورت محض نزاکتوں کی علامت نہیں ہے، بلکہ اس کے یہاں بھی ایسی جسارت موجود ہے جو اسے کامیابی سے شوق شہادت کی دہلیز تک لے جاتی ہے اور اسے سرخروئی بخشتی ہے۔ صرف مردوں کا جہادی کردار ہی اہم نہیں بلکہ اس راہ میں عورتوں کا کردار بھی مثالی بنتا ہے۔

کلام اقبالؔ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ''عورت'' کا ذکر مختلف پہلوؤں سے کیا ہے اور اس کے تاریخ ساز کردار کو سامنے لانے کے ساتھ ساتھ عصری احوال و افکار کے تناظر میں بھی اسے موضوع سخن بنایا ہے۔ اقبالؔ کا زمانہ معاشرتی اور نظریاتی اقدار کی زبردست

PDF Compressor Free Version

شکست وریخت کا زمانہ تھا اور عورتوں پر طرح طرح سے نہ صرف یہ کہ ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے بلکہ اس سے نجات کی راہ ڈھونڈنے کی بھی کسی کو بالعموم فکر نہ تھی۔ اقبالؔ نے ایک حساس اور دردمند فنکار کی طرح اس پہلو کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دیا اور صنف نازک کی عظمتوں کا ذکر کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہا کہ ؎

میں بھی مظلوم نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن اس عقدہ مشکل کی کشاد

یہاں اقبالؔ کا دوسرا مصرع بظاہر ایک قسم کی یاسیت لئے ہوئے ہے، لیکن اسے اگر ہم استعجابیہ اور سوالیہ انداز سے منسوب کر کے دیکھیں تو ہمیں اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہاں اقبالؔ دراصل ان باتوں پر غور وفکر کی دعوت دینا چاہتے ہیں جن کا تعلق عورتوں کی معاشرتی وعصری فلاح سے ہے۔

آج کی طرح اقبالؔ کے دور میں بھی ''آزادی نسواں'' اور ''تعلیم نسواں'' کے بڑے غلغلے تھے اور ''حجاب نسواں'' پر طرح طرح سے اعتراضات ہو رہے تھے۔ یہ سب کچھ جدید مغربی نظریے کی دین تھی، لیکن اقبالؔ کا کلام بتا رہا ہے کہ وہ ان معاملات میں اسلامی ہدایات کی روشنی سے ہی بہر صورت استفادہ کے قائل تھے اور بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ ''آزادی نسواں'' کے تعلق سے وی من لب (Women Lib) کے مخالف ہوتے ہوئے بھی اس کا فیصلہ خود عورتوں پر چھوڑنا ہی مناسب سمجھتے تھے، تاکہ وہ اسے مردوں کی تھوپی ہوئی بات سمجھ کر نہیں بلکہ خود اپنی سوچی اور سمجھی ہوئی بات سمجھ کر قبول کریں، چنانچہ انہوں نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ ؎

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں یہ زہر ہے، وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں مردان خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادی نسواں کہ زمرد کا گلو بند

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اقبالؔ عورت کی بصیرت پر یک گونہ اعتماد رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ نسوانی فکر وشعور کبھی مغربیت زدہ آزادی کے حق میں فیصلہ نہیں دے سکتا۔ تانیثی شعور پر ایسا اعتبار، غالباً سب سے پہلے اقبالؔ کی شاعری میں ہی ابھر کر سامنے آیا۔

عورتوں کی تعلیم اور عورتوں کا پردہ بھی اقبالؔ کے زمانے کا ایک سلگتا ہوا موضوع تھا اور اس تعلق سے طرح طرح کے خیالات پیش کئے جا رہے تھے اور اسلامی نظریہ پر ضرب لگانے کی پیہم کوششیں ہو رہی تھیں، چنانچہ اقبالؔ نے ''عورت'' کے تعلق سے اس باب میں بھی اپنے خیالات واضح طور پر نظم کئے ہیں ؎

اک زندہ حقیقت ہے مرے سینے میں مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
بے پردہ، یہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

یہ اشعار بتا رہے ہیں کہ اقبالؔ عورتوں کی تعلیم کے مخالف ہرگز نہیں، وہ بہر صورت جدید وقدیم تعلیم سے انہیں آراستہ دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن حصول تعلیم کے نام پر وہ کسی بھی حال میں عورتوں کی بے پردگی کے حامی نہیں، بلکہ اسلامی ہدایات اور فطری تقاضوں کے بموجب وہ عورتوں پر مردوں کی ''قوامیت'' کے قائل ہیں اور اس تعلق سے نہ صرف یہ کہ مردوں کو ان کی ذمہ داریوں پر توجہ دلاتے ہیں بلکہ اس راہ میں غفلت کے مآل بد سے ہوشیار بھی کرتے ہیں اور صاف لفظوں میں بتاتے ہیں کہ جو قوم اپنی عورتوں کی عزت اور حفاظت نہیں کرتی وہ تباہ وبرباد ہو جاتی ہے۔ عورتوں کی تعلیم کے سلسلہ میں اقبالؔ کا نظریہ کیا ہے؟ وہ ان اشعار سے کھل کر سامنے آجاتا ہے ؎

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انساں کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

PDF Compressor Free Version

بیگانہ رہے دین سے گر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

اقبالؔ کے نزدیک بلاشبہ ایسی تعلیم جو عورتوں سے ان کی نسوانیت چھین لے، ان کے حق میں ہی نہیں، بلکہ پورے معاشرے کے حق میں اور علم و ہنر کی حقیقی ترقیات کے حق میں ابدی موت کے مصداق ہے۔ اقبالؔ کو عورتوں کی جدید تعلیم سے کوئی پرخاش نہیں ہے، مگر وہ ہر حال میں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اسے دین سے بیگانہ اور مغربی تہذیب کا پیروکار نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ اس میں نقصان ہی نقصان ہے۔ یہ طبقہ نسواں بلکہ پوری انسانی برادری کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اقبالؔ عورت کو شمع محفل بنانے کے قائل ہرگز نہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صاف لفظوں میں حجاب نسواں کی حمایت کی ہے اور بے پردگی کے مضر اثرات سے صاف صاف باخبر کیا ہے ۔

تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے
وہ خلوت نشیں ہے، یہ جلوت نشیں ہے
ابھی تک ہے پردے میں اولاد آدم
کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ، آئینہ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

یہ اشعار بتا رہے ہیں کہ کلام اقبالؔ میں عورتوں کے تعلق سے صرف حجاب پسندی کی وکالت ہی نہیں کی گئی ہے اور مغربی تہذیب کو ناپسندیدہ ہی نہیں بتایا گیا ہے بلکہ اس کے فطری اور فلسفیانہ اسباب و علل بھی سامنے لا دیے گئے ہیں اور بتا دیا گیا ہے کہ جب دل کا آئینہ مکدر ہو تو محض نگاہ کی روشنی کسی کام کی نہیں۔

اقبالؔ چاہتے ہیں کہ دل کا آئینہ روشن رہے، تاکہ ہم حقائق کا ادراک کر سکیں اور عورتوں کو قرار واقعی تحفظ مہیا ہو سکے۔ ''عورت'' اپنے آپ میں چاہے ایک ایسی انوکھی پہیلی ہی کیوں نہ ہو جسے سمجھنے میں بظاہر مردوں نے بار بار مات کھائی ہو، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عورت کو ایسی پہیلی بنانے میں بہر حال مردوں کا اور بالخصوص مغرب پسند مردوں کا پورا پورا ہاتھ ہے۔

عورت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب صرف فلسفہ کی قوت سے مہیا نہیں ہو سکتا۔ آج عورت کے بارے میں جو نظریے قائم ہو رہے ہیں اور اس کی جو حالت نظر آ رہی ہے اس کی ذمہ داری مردوں پر ہے اور یہ سب کچھ انہیں سوچنے کی ضرورت ہے کہ اس کے نتیجے میں سماج کہاں پہونچ گیا ہے ۔

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں

کوئی پوچھے حکیم یوروپ سے
ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بیکار و زن تہی آغوش

علامہ اقبالؔ کے ان اشعار میں نہ صرف یہ کہ گہرا طنز ہے بلکہ ان میں شاعر نے جہاں عورت کی بزرگی و بے گناہی اور شرافت کا اعترافی ذکر لایا ہے وہیں ایک بڑا اور چبھتا ہوا معاشرتی سوال بھی سامنے رکھ دیا ہے جس کا مدعا اس زندہ حقیقت کی طرف سنجیدگی سے توجہ دلانا ہے کہ مساوات مرد و زن کا مغربی نعرہ شخصی اور سماجی زوال کو دعوت دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ کلام اقبالؔ میں عورت کو مختلف پہلوؤں سے نہایت جامع انداز میں جگہ ملی ہے۔ بیشک یہ اقبالؔ کے فلسفیانہ، اخلاقی اور پیامی شاعری کا بہترین حصہ ہے اور اس کی ہمہ جہت عصری معنویت اور افادیت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

علی ابراہیم آرزو

Moh. Shahjuma, Post Sasaram, Rohtas 821115 (Bihar) (Mob 9304069827)

پروفیسر حسن آرزو کی ادبی اور علمی خدمات

ادب اور بالخصوص اردو ادب کے مطالعے میں مخفی علوم کو پہلی بار اردو والوں سے متعارف کرانے کا سہرا پروفیسر حسن آرزو کے سر ہے۔ پروفیسر حسن آرزو کی پیدائش ۱۳ر جنوری ۱۹۳۶ء کو اپنے آبائی وطن سہسرام میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام حفیظ احمد تھا۔ آپ کے پردادا علی ابراہیم انگریزوں کے وقت میں پرگنہ کڑا، الہ آباد میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور صاحب تصنیف بھی تھے۔

پروفیسر حسن آرزو کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی جہاں ان کی والدہ نے بچپن ہی میں حالی کی مسدس اور شیخ سعدی کا کلام یاد کرا دیا تھا۔ اس بات کی تصدیق ''مسلم شعرائے بہار'' (جلد ۶ صفحہ نمبر ۳۶) سے کی جاسکتی ہے۔ حسن آرزو جب ذرا بڑے ہوئے تو ان کا اسکول میں داخلہ ہوا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے پٹنہ یونیورسیٹی تشریف لے گئے جہاں سے انہوں نے ۱۹۵۹ء میں امتیازی حیثیت سے اردو میں اور ۱۹۶۲ء میں فارسی میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ آپ کے استادوں میں اختر اورینوی، جمیل مظہری، سید محمد حسنین اور مولانا انوار الحق شہودی کا نام قابل ذکر ہے۔ آپ نے "مهنت مها ودالیه" میں اردو کے استاد کی حیثیت سے کام کیا، پھر جگجیون کالج آرا میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء میں ایس، پی جین کالج سہسرام میں شعبۂ اردو فارسی میں لکچرر ہوئے اور تاحیات وہیں درس وتدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آپ کے تلامذہ میں بطور خاص اردو کے مشہور افسانہ نگار حسین الحق اور شفق قابل ذکر ہیں۔ آپ نے ۱۰ر محرم الحرام بمطابق ۹ر جون ۱۹۹۵ء بروز جمعہ انتقال کیا۔ آپ کا مزار حضرت غلام حسین عرف چندتن شہید پیر کی پہاڑی کے پاس واقع ہے۔

پروفیسر حسن آرزو کے اندر ادبی ذوق پیدا کرنے میں کلیدی رول خود ان کی والدہ ماجدہ کا رہا ہے۔ دراصل آپ کے نانا سید غلام حسین صاحب مرحوم باذوق اور صلاحیت مند انسان تھے۔ آپ کا ایک بڑا مطبع بھی بنارس میں تھا۔ علم ودانش کا سرچشمہ سید غلام حسین سے ہوتا ہوا آپ کی والدہ تک پہنچا اور پھر وہاں سے آپ تک۔ آپ نے بچپن میں ہی ادب کی وہ کتابیں پڑھنی شروع کردی تھیں جو عموماً انسان اپنی جوانی میں پڑھنا شروع کرتا ہے۔ یہ ادبی ذوق زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہا۔ میرے اس دعوے کا ثبوت خود آپ کے استاد محترم جناب اختر اورینوی کی اس تحریر سے فراہم ہوتا ہے کہ:

> ''ان کی (حسن آرزو) شکیل صورت ان کے ادبی اور فنی ذوق سے مکمل طور پر مطابقت رکھتی ہے۔ ادبیات سے ان کا گہرا شغف، ان کی خوبصورت نظموں میں فصاحت اور معنی خیزی پیدا کردیتا ہے اور ان کے تنقیدی مضامین میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے، جن میں ہمیشہ تخلیقی شان موجود رہتی ہے۔ وہ اپنے تنقیدی فیصلوں میں بہت متوازن رہتے ہیں، ہر چند کہ رومانی ادب کے شائق ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ کلاسیکی حسن کے دلدادہ بھی، یہی وجہ ہے نظم ونثر دونوں کی اصناف میں ان کا ذوق سلیم اعتدال کے حفاظتی دھارے میں بہتا ہے۔''
>
> (بحوالہ ''نئے معاشرے کا تنہا آدمی'')

پروفیسر حسن آرزو بنیادی طور پر اردو نثر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آج سے تقریباً ۴۷ سال پہلے انہوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ''نئے معاشرے کا تنہا آدمی'' ہے۔ کتاب میں فنون لطیفہ کا عمرانیاتی جائزہ لیا گیا ہے جو آج کے معاشرے پر بھی ہو بہو صادق ہوتا نظر آتا ہے گویا ان کی نگاہ

PDF Compressor Free Version

آنے والے پچاس سال آگے پرتھی۔ یہ کتاب رسالہ "مریخ" میں سلسلہ وار شائع ہوتی رہی۔ اس کے بعد منظر عام پر آنے والی کتابوں میں "اردو کے مخفی افسانے"، "سعادت یار خان رنگین: حیات و نگارشات"، "مخفی تنقید و تحقیق"، "سلطان شیر شاہ سوری: احوال و آثار" قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ کتابیں "اردو کی مخفی داستانیں" اور "تنقید محض اور فرہنگ ریختی" زیر طبع ہیں۔ پروفیسر آرزو کی کتابوں میں "سعادت یار خاں رنگین: حیات و نگارشات" ایک ایسی کتاب ہے، جس پر ان کو ڈی لٹ کی ڈگری حاصل ہوئی۔ دراصل یہ مقالہ پی ایچ۔ڈی کے لئے داخل کیا گیا تھا، مگر اس مقالے کو ریسرچ کمیٹی نے دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ ان کو ڈی۔لٹ کی ڈگری عطا کی جائے۔ اسی طرح ان کی ایک کتاب "سلطان شیر شاہ سوری" ہے، جسے ہندوستان کی نامور اکاڈمیوں نے متعدد بار انعام و اکرام سے نوازا۔ انعام و اکرام سے تنگ آکر آخر کار انہوں نے ایک پریس کانفرنس کی جس میں انہوں نے کہا کہ اب میں اس کتاب پر انعام نہیں لوں گا، بلکہ یہ انعام دوسرے لکھنے والوں کو دیا جائے۔

پروفیسر اختر اورینوی نے اپنے بیان میں کہا کہ جب "نئے معاشرے کا تنہا آدمی" سلسلہ وار رسالے میں شائع ہونے لگا تو شروع میں ہی اہل نظر اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ ڈاکٹر محمد محسن اور مجیب بہاء الدین احمد (مصنف "گلستان ہزار رنگ") نے اس مقالے کی بہت تحسین کی۔ پروفیسر حسن آرزو کی تنقید و تحقیق اوروں کی طرح محض تجزیوں پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ یہ اس کا حل بھی نکالتے ہیں اور یہ حل مسئلوں کی تفہیم و تنقید میں کافی معاون ثابت ہوتا ہے۔

مخفی علوم پر پروفیسر حسن آرزو کو کچھ اس طرح دسترس تھا کہ ایک مرتبہ ایک محفل میں کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے، اسی اثنا میں آپ وہاں تشریف لے آئے۔ اس محفل میں آپ نے دیکھا کہ پچھم کی دیوار پر ایک چھپکلی ہے۔ کچھ دیر غور سے اس چھپکلی کو دیکھنے کے بعد پروفیسر حسن آرزو نے فرمایا کہ ابھی سے آٹھ منٹ بعد یہ چھپکلی پورب کی دیوار پر آئے گی اور نیچے زمین پر گرے گی۔ آٹھ منٹ جیسے ہی گزرا تھا کہ یہ واقعہ پیش آ گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر وہاں بیٹھے جناب پروفیسر رام جی سہائے (ریٹائرڈ) سابق H.O.D. Economics، جناب سکھ دیو سنگھ پرنسپل ایس۔پی جین کالج سہسرام (ریٹائرڈ) جناب مرحوم ڈی کے ٹھکر جی پرنسپل ایس۔پی۔جین کالج سہسرام اور ان کے علاوہ شہر کے روسا و ادیبوں نے اپنے دانتوں تلے انگلی دبالی۔ تصدیق کے لئے پروفیسر رام جی سہائے سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریر کا عکس حاضر ہے۔

Prof. Ramjee Sahay
Ex Professor & Head
Department of Economics
S.P. Jain College, Sasaram

Veer Kunwar Singh University
Ara (Bhojpur)

Ref.
Date

University Professor & Head
S. P. Jain College, Sasaram
V. K. S. University, Ara

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ سعادت یار خان رنگین کی تاریخ پیدائش آپ نے اپنی تحقیق کے مطابق کچھ الگ نکالی۔ اس پر سوال کرتے ہوئے جناب مالک رام نے ان سے پوچھا آپ نے جو تاریخ پیدائش نکالی ہے وہ کس طرح نکالی۔ اس پر موصوف نے جواب دیا کہ میں نے ان کی غزلوں سے ان کے خیالات کو جانا پھر ایسے خیالات والے انسان کن کن ساعتوں میں پیدا ہوتے ہیں، یہ پتہ چلایا تو پتہ چلا کہ ان خیالات والے انسان ان تاریخوں ہی میں پیدا ہوتے ہیں، اس طرح میں نے ان کی تاریخ پیدائش نکالی۔ جب مالک رام نے اس کی ایک کاپی انڈیا ہاؤس لائبریری لندن بھیج کر صحیح تاریخ دریافت کرائی تو بالکل وہی تاریخ سامنے آئی جو حسن آرزو نے اپنے مخفی علوم کی مدد سے نکالی تھی۔

پروفیسر حسن آرزو بہار کے نمائندہ ناقدوں میں شمار کئے جاتے ہیں اور انہوں نے مخفی علوم کے ذریعہ ادب کے مطالعے کا جو طرز شروع کیا وہ آہستہ آہستہ مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی نمایاں مثال اردو کے مشہور افسانہ نگار شموئل احمد ہیں۔ شموئل احمد جن دنوں سہسرام میں تھے وہ پروفیسر حسن آرزو سے مسلسل رابطہ میں رہتے تھے اور اہل نظر واقف ہیں کہ شموئل احمد کے علاوہ اردو رسائل میں اور کئی حضرات بھی مخفی طریقہ تنقید کا

PDF Compressor Free Version

استعمال کررہے ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پروفیسر آرزو نے تنقید وتحقیق کے بنیادی وظیفے سے انحراف کیا بلکہ سچ یہ ہے کہ انہوں نے مطالعہ ادب کے مراحل میں مصنف کی شخصیت یا بہ الفاظ دیگر شخصی مطالعے کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ عین ممکن ہے آج جب کہ صرف متن کے مطالعے کی اہمیت پر زور دیا جارہا ہے شاید شخصی مطالعے پر سوالیہ نشان کھڑا ہو، اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ مصنف کی تھوڑی بہت اہمیت بہرحال باقی رہے گی اور مخفی طریقہ تنقید کے دورانِ مطالعہ ایک Supporting Element سے انکار نہیں کیا جاسکے گا۔

پروفیسر حسن آرزو کی تنقیدی کاوشوں کو نظر تحسین سے دیکھنے والوں میں پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، جناب مالک رام، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، پروفیسر عبدالمغنی، کلام حیدری، حسین الحق، شفق، درجنوں ناقدوں اور فنکاروں کے اسمائے گرامی کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ بہار کی یونیورسٹیوں میں آپ پر تحقیق کا کام بھی ہورہا ہے۔

تنقید کے علاوہ آپ کی دلچسپی کا دوسرا میدان شاعری تھا۔ آپ کی غزلیں اور نظمیں آپ کی حیات میں رسائل میں شائع ہوتی رہیں اور بہار کی سطح پر ناقدوں نے آپ کی شعری حیثیت کا بھی اعتراف کیا۔ اس کا ثبوت پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی کتاب ''بہار میں اردو نظم نگاری'' ہے، جس میں آپ پر باضابطہ ایک باب قائم کیا گیا ہے۔ پروفیسر حسن آرزو کی شاعری اپنی بہترین لفظیات سے متاثر کرتی ہے اور اس کے مضامین بھی اہمیتوں کا احساس دلاتے ہیں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

نیستی کی دھند کو رنگیں بنا کر دیکھ لو
ڈوبتا سایہ ہوں ، مجھ کو سجا کر دیکھ لو
دیدنی منظر ہے یہ، تم پھر نہ دیکھو گے اسے
ٹوٹتا جاتا ہوں میں ، اس لمحہ آکر دیکھ لو
اول و آخر فنا ہے سب فریب آئینہ
تھام کر دست فنا گھر میرے آکر دیکھ لو
نیند ہے ازلی حقیقت آرزو بھی سوگیا
ہو سکے تو دشت امکاں کو جگا کر دیکھ لو

چمن میں آکے اٹھائیں بہار کا احساں
کہ لالہ کاریٔ صحرا کا اعتبار کریں
اِدھر حرم ہے اُدھر ہے صنم کدوں کی قطار
قدم اٹھے تو کوئی راہ اختیار کریں
ستم کشوں پہ بیاباں کا حق بھی ہے لیکن
جگر میں خوں ہو تو کانٹوں کو لالہ زار کریں
جو وہ بنا نہ سکے آرزو کے دل کو چراغ
تو دے کے جذبہ پروانہ بیقرار کریں

❁❁❁

تاریخ ادب، تذکرے اور بیاض کا فرق

غلام علی بلگرامی نے لکھا ہے کہ بیاض اور تذکرے میں فرق یہی ہے کہ بیاض میں صرف شاعر کا کلام ہوتا ہے اور بیاض میں شاعر کے احوال واشعار دونوں ہی ہوتے ہیں، گویا بیاض کا دائرہ تذکرے کی بہ نسبت محدود ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسا کہ تاریخ ادب کے مقابلے میں تذکرے کا دائرہ یوں محدود ہے کہ تذکرہ نگار جب شاعروں کا تعارف پیش کرتا ہے تو کسی تفصیل میں نہیں جاتا بلکہ صرف تھوڑی سی ضروری معلومات کی پیش کش پر ہی اکتفا کرلیتا ہے، جب کہ تاریخ ادب میں شاعروں اور ادیبوں کے حالات اور ان کی تصنیفات اور تخلیقات کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے اور ماحول کے اثرات اور تبدیلیوں پر بھی نظر رکھی جاتی ہے۔ یہ گیارہویں صدی کی بات ہے کہ ایرانی ادیبوں نے ایک اصطلاح کے طور پر لفظ ''تذکرہ'' کا اطلاق ان کتابوں پر کیا جن میں شعرا کے مختصر حالات اور ان کا انتخابی کلام درج کیا جائے اور پھر یہ اصطلاح اردو میں بھی آئی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے تذکرے اور بیاض کا فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ تذکرے کے برخلاف، اگر نام اور تخلص کے ساتھ شاعروں کا کلام یا منتخب اشعار لکھ دیے جائیں یا لکھنے والے کے ذوق سلیم کے مطابق منتخب اشعار کی اجتماعی تصنیف سامنے آئے تو وہ بیاض ہے۔ (ماخوذ)

PDF Compressor Free Version

ارشد حسن

"Hassan Villa" Ward No. 26, Hospital Road, Meer Nagar, Araria 854311

حالی کی تنقید نگاری: مقدمہ کی روشنی میں

مولانا الطاف حسین حالی کو اردو تنقید نگاری کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔ مولانا حالی سے ہی باضابطہ تنقید کا دور شروع ہوتا ہے۔ ان کا ''مقدمہ شعروشاعری'' نظریۂ شعر پر اہم اور مستند کتاب ہے۔ ان کے تنقیدی نظام میں وضاحت وصراحت پائی جاتی ہے اور اسی وضاحت اور سادگی نے ان کے انداز نظر کو عام فہم اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ موصوف نے پہلی مرتبہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ شعروشاعری محض تفریحی امر نہیں بلکہ اس کا سماج اور زندگی سے بہت گہرا رشتہ ہے اور تنقید کو بہر حال انتہائی ذمہ داری سے اپنا کام کرنا چاہئے۔

حالی نے اپنے مقدمہ کے پہلے حصے میں اصولی اور نظریاتی باتیں پیش کی ہیں جسے ''نظریاتی تنقید'' کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ دوسرے حصے میں اصناف سخن جیسے غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ پر عملی اور تجرباتی تنقید پیش کی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غزل جیسی مقبول اور فرسودہ صنف سخن پر انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کیا ہے، غزل کی کمزوریوں اور خامیوں کی نشان دہی کی ہے اور ساتھ ہی اس کی اصلاح کے لیے کچھ مشورے بھی دیے ہیں۔ انہوں نے اچھی شاعری کے لیے تین شرائط پر زور دیا ہے یعنی تخیل، مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ۔

تخیل

شاعری کے لیے ''تخیل'' سب سے مقدم اور ضروری چیز ہے۔ حالی نے بتایا ہے کہ قوت تخیل جس فن کار یا شاعر میں جس درجہ اعلیٰ ہوگی اس کی تخلیق بھی اعلیٰ ہوگی۔ دنیا میں جتنے بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں ان میں قوت تخیل کی بلند پروازی اور قوت ممیزہ کی حکومت دونوں ساتھ ساتھ پائی جاتی ہے۔ بقول حالی:

> ''یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے جو اکتساب سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ طاقت ہے جو ایک شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے۔''

قوت تخیل سے شاعر ایسے ''خیال'' کو جو کئی جلدوں میں بیان ہو سکے، ایک لفظ میں ادا کر دیتا ہے۔ مثلاً

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

مطالعۂ کائنات

تخیل کے بعد حالی کے نزدیک شاعری کے لیے دوسری شرط کائنات کا مطالعہ ہے۔ یعنی نسخہ کائنات اور اس میں خاص طور پر نسخہ فطرت انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جانا چاہیے۔ بغیر کائنات کے مطالعہ کے شاعری میں فطرت کی گہرائیوں کو پیش کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی ہے۔ مثلاً

بوے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

تفحص الفاظ

حالی نے شاعری کے لیے تیسری اور اہم شرط یہ بتائی کہ شاعر کو الفاظ پر اتنی قدرت حاصل ہو کہ کسی بھی خیال کو ظاہر کرنے کے لئے اسے بہت زیادہ ہاتھ پاؤں نہ مارنا پڑے اور اس کے پاس ذخیرۂ الفاظ ہو اور لفظوں کے صحیح انتخاب کی بھرپور صلاحیت ہو۔

حالی شاعری کی شرائط بیان کرنے کے بعد اس کی خوبیوں کو بھی بیان کرتے ہیں جو ملٹن (Milton) کے نظریے سے ماخوذ ہے۔

PDF Compressor Free Version

بقول ملٹن:

''شعر کی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔''

حالی ملٹن کے نظریے کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ:

''ہمارے نزدیک کلام کی سادگی کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو، مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو اور زبان جہاں تک ہو روزمرہ کی بول چال کے قریب ہو۔ جس قدر شعر کی ترکیب معمولی بول چال سے بعید ہوگی اس قدر سادگی کے زیور سے معطل سمجھی جائے گی، مثلاً۔

کیا جانے اسے وہم ہے کیا میری طرف سے
جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا

جوش سے مراد ہے کہ مضمون بے ساختہ الفاظ اور موثر پیرایے میں بیان کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادے سے یہ مضمون نہیں باندھا بلکہ مضمون نے شاعر کو متوجہ کر کے اپنے تئیں اسے بندھوایا ہے۔''

جوش سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ مضمون خواہ مخواہ نہایت زوردار اور جوشیلے لفظوں میں ادا کیا جائے۔ ممکن ہے الفاظ نرم، ملائم اور دھیمے ہوں، مگر ان میں غایت درجے کا جوش چھپا ہوا ہو، مثلاً۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

''اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد نہیں کہ ہر شعر کا مضمون حقیقت نفس الامری پر مبنی ہونا چاہیے بلکہ یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نفس الامر میں یا لوگوں کے عقیدہ میں فی الواقع موجود ہو۔ مثلاً میر انیس ماتم سید الشہدا میں لکھتے ہیں۔

تھراتے ہیں لوح و قلم و عرش معظم
کرسی پہ یہ صدمہ کہ ہل جاتی ہے ہر دم
باندھے ہیں ملائک کی صفیں حلقہ ماتم
ڈر ہے نہ اُلٹ جائے کہیں دفتر عالم
ہاتھ سے عطارد کے قلم چھوٹ پڑا
ہر فرد پہ اک غم کا فلک ٹوٹ پڑا''

اردو کے بعض شعرا ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ان ساری خوبیوں کو مقدم سمجھا اور اس کا لحاظ بھی رکھا، لیکن بعض شعرا ایسے بھی گزرے ہیں جن کے یہاں ان میں سے کسی نہ کسی چیز کی کمی پائی جاتی ہے۔ اب مومن کے اس شعر کو دیکھیں۔

ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوے آشیاں نہیں

اس میں شاعر کہتا ہے کہ:

''اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ایک ضروری بات ہے اور اس لیے جب کبھی میں ایک بلا سے محفوظ ہوتا ہوں تو دوسری بلا کا منتظر رہتا ہوں۔''

حقیقت میں اس شعر میں ''اصلیت'' اور ''جوش'' دونوں باتیں پائی جاتی ہیں مگر تیسری چیز یعنی 'سادگی' البتہ نہیں پائی جاتی کیوں کہ جب تک یہ جملہ ''اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضروری ہے'' شعر میں اضافہ نہ کیا جائے، عام ذہن معنی مقصود کی طرف انتقال نہیں کر سکتے۔

اسی طرح آتش کہتے ہیں۔

فرصت اک دم عہد طفلی میں نہ رونے سے ملی
پرورش پایا ہوا ہوں دامن سیلاب کا

اس شعر میں شاید مشکل سے کسی نہ کسی قسم کی اصلیت تو نکل آئے، لیکن جیسا کہ ظاہر ہے نہ بیان میں سادگی ہے نہ جوش۔ اب آتش ہی کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیں۔

تری تقلید سے کب در کی نہ ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انسان کی چال اس کا چلن بگڑا
امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا، نہ اک تار کفن بگڑا

یہ دونوں شعر صاف ہیں، مگر ان میں سادگی بیان کے سوا نہ تو اصلیت ہے اور نہ ہی جوش۔ اب چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمائیں جن میں شاعری کی تینوں شرائط اور تینوں خوبیاں موجود ہیں۔

PDF Compressor Free Version

اب تو گھبرا کے کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

(ذوقؔ)

خوشی جینے کی کیا مرنے کا غم کیا
ہماری زندگی کیا اور ہم کیا

(غالبؔ)

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لیے آئے تھے کیا کر چلے

(میر دردؔ)

مندرجہ بالا تمام مثالوں میں بیان کی سادگی، جوش اور اصلیت تینوں باتیں بدرجہ احسن پائی جاتی ہیں۔

بہ غور دیکھا جائے تو حالیؔ کی بیان کردہ شرائط اور خوبیاں آج بھی شاعری کے لیے نہایت ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ مذکورہ بالا امور کے بعد حالیؔ نے ''نیچرل شاعری'' پر بھی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ:

''نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظ اور معنی دونوں حیثیتوں سے 'نیچرل' ہو یعنی فطرت اور عادت کے موافق ہو۔''

اور یہ درست بھی ہے کہ نیچرل شاعری کے تحت شعر میں ایسی باتیں بیان کی جانی چاہیے جیسی کہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہیے، مثلاً

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(مومنؔ)

ترے رخسار و گیسو سے بتا تشبیہ دوں کیوں کر
نہ ہے لالہ میں رنگ ایسا، نہ ہے سنبل میں بو ایسی

(ظفرؔ)

بہرکیف، حالیؔ کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں ایک کلاسیکی رچاؤ موجود ہے، نہ کہیں عامیانہ پن ہے اور نہ ہی اُلجھاؤ اور پیچیدگی، نہ سوقیانہ طرزِ تحریر، نہ کہیں اپنے علم و فضل سے قارئین کو مرعوب کرنے کی کوشش، نہایت ہی سلجھے ہوئے انداز میں جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر وہ اپنے نظریات کو پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ وہ اپنی ہی آواز میں بات کرتے ہیں، مستعار آواز نہیں لیتے۔ ڈاکٹر وارث علوی لکھتے ہیں:

''مذہب، سیاست، تاریخ، سماج اور اپنے وقت کی تہذیبی اور تمدنی زندگی میں سر سے پیر تک ڈوبا آدمی جب مقدمہ لکھنے بیٹھتا ہے تو ایسا لکھتا ہے کہ یہ شخص زندگی بھر شاعری کرتا رہا ہے اور شاعری ہی پڑھتا رہا ہے۔''

حالیؔ نے اپنے دامن تنقید کو سبھی غلاظتوں اور لعنتوں سے پاک رکھا ہے۔ بقول کلیم الدین احمد:

''حالیؔ نے صاف اور سادہ طرز ایجاد کی، لیکن اس طرز میں بے رنگی نہیں ہے، پھیپھسا پن نہیں ہے، اس میں ایک لطافت ہے، ایک جاذبیت ہے اور رنگینی بھی اور پھر یہ تنقیدی مسئلوں پر بحث کرنے کے لیے موزوں بھی ہے۔''

حالیؔ نے مغربی ادب سے بھی بلاواسطہ نہ سہی بالواسطہ ہی استفادہ کیا ہے اور یہ حالی کا اپنا اجتہاد تھا جس پر اردو تنقید کی ایک پوری عمارت کھڑی ہوئی۔ ❁❁

قلم کار حضرات توجہ دیں

اپنی تخلیق کے ساتھ اپنا نام جو آپ کے بینک اکاؤنٹ میں ہے، انگریزی میں ضرور لکھیں، ساتھ ہی بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFSC Code بھی تحریر کریں۔ اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ بھی انگریزی میں تحریر کریں تاکہ آئندہ آپ کے معاوضے کی رقم سیدھے آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کر دی جائے اور آپ کو دشواری نہ ہو۔ اس اعلان کو خاص طور پر وہ سبھی قلم کار بھی نوٹ فرمالیں جن کا کسی بھی طرح کے لین دین کا تعلق بہار اردو اکادمی سے ہے۔

—— سکریٹری

PDF Compressor Free Version

افسانے

ڈاکٹر نگہت نسیم

21, Junction Road, Moorebank, New Suoth Wales 2170 (Australia)

کریلے

امی جی کی کا بس چلے تو کمیٹی ڈال کر کریلے خریدیں اور پھر دنیا سے بے خبر ہو کر پکائیں، کتنی بار کہا ہے کہ ہمیں نہیں کھانے یہ کڑوے کسیلے کریلے، توبہ۔ زیبا باجی کی جھنجھلاہٹ عروج پر تھی۔ جتنی تیز زبان چل رہی تھی اس سے زیادہ چھری کریلوں پر، امی جی کو کریلے پکانے ہمیشہ سے پسند تھے، پہلے تو اتنی چاہ سے خریدتیں، چھانٹ چھانٹ کر ایک ایک کریلا ایک طرف رکھتی جاتیں جیسے کوئی اپنی یادیں ایک ایک کر کے سمیٹتا جاتا ہے۔ یہ وہ واحد سبزی تھی جس پر امی جی نے کبھی بھاؤ نہیں کیا۔ جتنی مہنگی بھی ملتی اتنے ہی دام میں خرید لیتیں۔ اتنی خاموشی سے نظریں جھکائے، ایسی لگن سے پکایا کرتیں جیسے کوئی عبادت کر رہی ہوں، اگر کوئی ان سے کوئی بات کرنے کی کوشش بھی کرتا تو وہ یوں دیکھتیں جیسے کسی اور زبان میں کوئی بات کر رہا ہو۔ دوسرے دن امی جی کی وہی ہدایات ہوتیں اور ہم ہوتے۔

زیبا باجی ہم تین بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں، ان کے بعد سہیل بھائی، پھر میں ان سے دو برس چھوٹی۔ ابا جی زیادہ تر مسکرانے کی حد تک گھر میں شریک ہوا کرتے تھے، ہم سب امی جی کے لیکچر کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ ہمیں معلوم ہوتا تھا کہ اب امی جی نے کیا کہنا ہے۔ اس پر سہیل بھائی اکثر امی جی کی گود میں سر رکھ کر انہی کی نقل اتارا کرتے تو امی جی ہنس دیا کرتی تھیں۔ چھوٹے سے آرام دہ گھر میں زندگی بہت ہی خوبصورت تھی، جب تک سہیل بھائی اپنی میرین کی پڑھائی کی غرض سے لندن نہ گئے تھے۔ شروع شروع میں جب وہ گئے تو جیسے ہم سب نے بہلنا چھوڑ دیا تھا۔ اُداس ہونے کے بہانے ڈھونڈنے لگے تھے، لیکن اب جیسے ایک عادت کی طرح ان کی کمی کی بھی عادت ہو چلی تھی، ہم ان کے بغیر رہنا سیکھ گئے تھے۔ زندگی میں یادیں اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لیں تو آسانیاں پیدا ہو ہی جاتی ہیں، سو ہم سب بھی ایک بار پھر آسانیوں کی طرف لوٹنے لگے تھے۔

امی جی کو سب یاد رہتا تھا، ابا جی کو کیا پسند ہے؟ ان کے اُٹھنے سے لے کر سونے تک کے اوقات انہیں ازبر تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ آج ابا جی کیا سوچیں گے۔ ہماری حیرت دیدنی ہوتی جب وہ کہتیں کہ تمہارے ابا جی نے اب یہ کہنا ہے۔ ہمیں اکثر یہی گمان رہتا کہ ان دونوں میں کوئی ٹیلی پیتھی ضرور ہے۔

انہیں ہمیشہ پتہ رہتا تھا کہ سہیل بھائی آج کیا کھائیں گے؟ آج کیا پہنیں گے.....؟ ان کی حساب کی کتاب کہاں ہے.....؟ تو انگلش کی کاپی کہاں رکھ کر بھول گئے ہیں۔ ان کے دوستوں کی فہرست حتیٰ کہ دوستوں کی پسند بھی امی جی کو ازبر تھیں۔ سہیل بھائی دو برسوں سے گھر نہ لوٹے تھے۔ آج کل وہ لندن سے ہوتے ہوئے تسمانیہ جا پہنچے تھے۔ ان سے رابطہ ایسے ہی تھا جیسے خزانہ ہاتھ لگ جائے گو کہ ان کے گھر نہ ہونے کے ہم سب عادی ہو چکے تھے، لیکن امی جی کا زیادہ وقت ان کے کمرے میں ہی گزرتا تھا۔

امی جی کو یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ کس دن زیبا باجی یونیورسٹی سے واپسی پر اتنا تھک چکی ہوں گی کہ ان سے روٹیاں پکانا مشکل ہو جائیں گی، سو وہ ان کے آنے سے پہلے ہی پکا لیا کرتی تھیں۔ زیبا باجی کی خفگی بھی انہیں آرام کرنے پر کبھی منا نہ سکی تھی، سو انہوں نے بھی امی جی کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب رہ گئی میں۔ کالج سے واپسی پر انہی کے اِرد گرد گھومتے ہوئے میرا وقت گزر جاتا۔ مجھے اپنی امی جی کی جو بات سب سے زیادہ پسند تھی وہ ان کی خاموشی تھی۔ خاموشی ان پر بہت سوٹ کرتی تھی۔ امی جی ہمیشہ ہلکے رنگ پہنا کرتیں، دوپٹہ سر سے لے کر شانوں تک پھیلا کر

PDF Compressor Free Version

اوڑھا کرتیں۔غلافی آنکھیں جھکائے وہ دھیرے دھیرے مسکرایا کرتیں۔ بس امی جی خاموشی کی چادر میں بہت ہی مدبر لگتیں جیسے کوئی فلاسفر ہوں، جیسے ابھی کوئی فزکس کا کلیہ طول وعرض ایجاد کرلیں گی۔اب یہ الگ بات کہ جب وہ بولنے اور سمجھانے پر آجاتیں تو ان کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا،لیکن ابا جی کو ان کی خاموشی سے بہت وحشت ہوتی تھی اور وہ امی جی کی خاموشی کو توڑنے کے لئے ان دنوں خوب بولا کرتے اور اس وقت تک ابا جی کی آواز آتی رہتی، جب تک امی جی بول نہ پڑتی تھیں،تب ابا جی ہنس کر کہتے:

''رفاقت رشتوں میں توازن ہی تو سکھاتی ہے۔''

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھر بھر میں تو کیا اب سبزی والا تک جانتا تھا کہ امی جی کی خاموشی اس وقت سوا ہوجاتی ہے جب وہ کریلے خریدا کرتی ہیں، پر یہ بھی سچ تھا کہ کریلے کے ظاہری محاسن سے لے کر اس کی باطنی خوبیوں تک ان کی گہری نظر ہم سب کو بیزار رکھا کرتی تھی۔

''اللہ کے لئے امی جی پلیز کبھی کچھ اور بھی پکالیا کریں۔''

زیبا باجی اپنی کتابیں میز پر رکھتے ہوئے کبھی کبھی چیخ پڑتیں اور امی جی کا مسکراتا چہرہ یکدم اداس ہوجاتا،لیکن فوراً کہتیں:

''ارے بھئی تم فکر نہ کرو، تمہارے لئے تمہاری پسند کے کوفتے بنا رکھے ہیں۔''

زیبا باجی کا احتجاج اپنی جگہ صحیح تھا۔آج کل امی جی کچھ زیادہ ہی تواتر سے کریلے پکانے لگی تھیں۔اب تو کریلے پکاتے پکاتے آنسو بھی گر جاتے تھے جسے وہ چپکے سے اپنے آنچل سے پونچھ لیا کرتی تھیں، رات کو اکثر نیند سے اُٹھ جایا کرتیں اور دروازے تک کئی چکر کاٹ آتیں۔

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا، امی جی نے کریلے بہت شوق سے خریدے تھے۔زیبا باجی نے بکتے جھکتے کاٹے تھے۔امی جی نے عبادت کی طرح خاموشی اور لگن سے پکائے تھے، پر زیبا باجی خفا ہوگئی تھیں، اتنی زیادہ خفا ہوگئیں کہ اپنے کمرے سے اب باہر نہ نکل رہی تھیں، میں نے انہیں منانے کی بہت کوشش کی، پر ناکام ہوگئی، پھر میں نے سوچا کہ اب ابا جی کو اس معاملے کی پیروی کرنا ہی ہوگی، میں یہی سوچتی ہوئی اُن کے کمرے کی طرف چل پڑی اور دروازے پر ہی جیسے میرے قدم ٹھہر سے گئے، امی جی رو رہی تھیں، وہ کہہ رہی تھیں:

''مجھے سہیل بہت یاد آتا ہے جی۔وہ پچھلی بار فون پر کہہ رہا تھا کہ وہ کبھی بھی گھر آسکتا ہے۔آپ کو تو پتہ ہے اسے سرپرائز دینے کا کتنا شوق ہے۔جانے کب میرا بیٹا گھر آجائے۔اسے کریلے بہت پسند ہے نا جی، اسی لئے روز پکالیتی ہوں۔سوچیں بھلا کیا سوچے گا میرا بیٹا کہ ماں نے اس کی پسند کے کریلے تک نہ بنا کر رکھے۔یہ لڑکیاں تو سمجھتی ہی نہیں ہیں۔آپ تو سمجھتے ہیں نا میری بات۔''

اب امی جی یقیناً اپنی غلافی آنکھوں میں سرخ ڈوروں کے ساتھ ابا جی کو تائید میں دیکھ رہی ہوں گی اور ساتھ ساتھ اپنے نیلے سوتی دوپٹے سے اپنی آنکھیں بھی بیدردی سے صاف کرتی جارہی ہوں گی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری ماں کے آنسو میری آنکھوں میں رہنے آگئے تھے۔ امی جی اکثر کہا کرتیں:

''ماں کی کچھ باتیں ماں کے جانے کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہیں'' لیکن ہم تو آپ کی کئی باتیں آپ کی زندگی میں بھی نہ سمجھ پائے، ہم آپ کو نہیں سمجھ پائے امی جی.....نہیں سمجھ پائے.....

قندیل افکار

☆ سادگی میں حسن کا پرتو اجاگر ہوجاتا ہے

☆ بہادر وقتی طور پر ہار سکتے ہیں مٹ نہیں سکتے

☆ طاقت سے دشمن پر فتح پانا ادھوری فتح ہے

☆ کنجوسی تباہ کردیتی اور ہمیشہ کا غم دے جاتی ہے

☆ وطن کی حفاظت میں بہنے والا خون تاریخ وطن کی سرخی بن کر چمکتا رہتا ہے

☆ کارنامہ وہی ہے جو ریاضت ومشقت کا حاصل ہو

☆ وہی قوم زندہ رہتی ہے جو مرنے سے نہیں ڈرتی

☆ اگر سوتا ہی کمزور ہو تو ندی میں کبھی دھارے تیز نہیں ہوسکتے

☆ دنیا کا عظیم ترین افسانہ وہ ہے جو وطن کے شیدائی اپنے خون سے لکھتے ہیں

☆ یقیناً سادگی بھی ایمان کی ایک شاخ ہے

PDF Compressor Free Version

شاکر کریمی

گنج نمبر 1۔ بتیا 845438 (بہار)

زخم اور مرہم

زندگی کی ساری خوشیاں اور مسرتیں اسے حاصل تھیں۔ کوئی غم نہ تھا۔ اس کے گرد اداسیوں اور مایوسیوں کا نام ونشان تک نہ تھا۔ فرحت سے محبت کرنا ہی جیسے اس کی ہنستی کھیلتی زندگی کا مقصد تھا اور فرحت کا معصوم پیار اس کی زندگی کا بہترین سرمایہ۔ ہر دن، ہر لمحہ مسرت وشادمانی سے گزر رہا تھا۔ زندگی پرسکون تھی، ماحول نغمہ ریز تھا، لیکن ایک دن اچانک سب کچھ ختم ہوگیا۔ ایسا طوفان آیا جس نے اس کا سب کچھ تباہ وبرباد کردیا۔ ایسی ہولناک آندھی اٹھی جس نے اس کے سرمایہ حیات کو منتشر کردیا۔ ایک ایسا سیلاب آیا جو اس کی ساری خوشیاں بہالے گیا اور جب طوفان تھم گیا تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ نقش طوفان ہوکر رہ گیا ہے، تنہا، خانماں برباد، اس کی زندگی کا حاصل، خوشیوں کی مرکز فرحت کو اس حادثہ نے نگل لیا تھا، وہ اس سے منہ موڑ چکی تھی، پھر کبھی اس کی طرف نہ دیکھنے کے لئے۔ وہ اس سے روٹھ گئی تھی، پھر کبھی نہ منانے کے لئے۔

دن گزرتے رہے اور اس کے زخم مندمل ہونے کے بجائے ہرے ہوتے گئے۔ فرحت کا تصور اس کی یاد، درد بنتی گئی، پھر تو اس کا وجود مستقل ایک درد بن کر رہ گیا اور اس درد سے نجات پانے کے لئے خود فراموشی کی راہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ مئے نوشی کی راہ پر چل پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ سمندر کی گہرائیوں سے ڈوب کر ابھرنا آسان ہے، لیکن ان خوبصورت پیمانوں میں جھلملاتی رنگینیاں اپنے اندر پوشیدہ مستیوں کے باوجود آتش سیال ہیں، جو اس کے وجود کو کھوکھلا کردیں گی، اسے جلا کر خاک کردیں گی۔ وہ ان پیمانوں سے رحم کی بھیک بھی نہ مانگ سکے گا۔ اس کے باوجود وہ مطمئن تھا۔ عارضی طور پر ہی سہی وہ ان پیمانوں میں ڈوب کر عہد رفتہ کی جاں گسل یادوں اور اپنے آپ سے بیگانہ تو ہوجاتا تھا۔

وہ شراب کے سہارے خود فراموشی کی راہ پر چلتا، زندگی سے فرار کی گھڑی کا انتظار کرتا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک نئے موڑ نے اس کی کایا ہی پلٹ دی۔ ایک بار پھر وہ زندگی کی تمنا کرنے لگا۔ اس کی کھوئی ہوئی خوشیاں پتہ دینے لگیں۔ یادوں کے زخم مندمل ہونے لگے اور وہ محسوس کرنے لگا، انہونی ہونی ہوگئی، ناممکن ممکن ہوگیا۔ اس کی فرحت وہاں سے لوٹ آئی جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آتا۔ یہ سب شاہد کی بدولت ہوا جو ایک دن فرشتہ رحمت بن کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور اس کے زخموں پر ہمدردی کا پہلا پھاہا رکھا تھا۔

اردشیم کے وسیع ہال میں وہ سگریٹ اور شراب میں کھوئے ہونے کے باوجود محسوس کر رہا تھا کہ کئی دنوں سے اس کے قریب ہی بیٹھنے والا وہ نوجوان آج اس میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہا ہے اور جب اس نے رم سے لبریز چوتھا پیگ اٹھایا تو وہ نوجوان اس کے قریب آیا اور رم سے بھرا پیمانہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے مسکرا کر بولا:

''اب بس کیجئے۔ اس قدر بلانوشی اچھی نہیں!''

''آپ کون ہوتے ہیں روکنے والے!''

''دوست سمجھئے مجھے اپنا۔ ویسے میرا نام شاہد ہے اور مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔''

اس نے کچھ کہنا چاہا، مگر کہہ نہ سکا۔ ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔

''میں کئی دنوں سے آپ کو دیکھ رہا ہوں اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کوئی غم ایسا ہے، جس سے چھٹکارا پانے کے لئے آپ شراب کا سہارا لینے پر مجبور ہوگئے ہیں، حالاں کہ فرار کا یہ راستہ غلط ہے۔''

نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنی نشہ سے بوجھل آنکھوں میں بھر آنے والے

PDF Compressor Free Version

آنسوؤں کو پی جانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا:

''جس کی زندگی میں غم ہی غم ہو وہ اور کیا کرے۔ کیسے بہلائے اپنے آپ کو۔''

''لیکن شراب تو علاج نہیں۔ یہ تو خود ایک مرض ہے، مہلک، تباہ کن۔ غموں سے نجات پانے کے اور بھی طریقے ہیں۔ فی الحال آپ دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہو جایئے، غموں کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ آیئے میرے ساتھ!'' وہ نوجوان کی روشن اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے آنکھیں نہ ملا سکا۔

ایک شام، شاہد نے اس کے اعزاز میں اپنے دوستوں کو پرتکلف پارٹی دی۔ جب سارے دوست آ گئے تو شاہد نے اس سے کہا:

''آیئے میں آپ کو اپنے دوستوں سے ملاؤں..... آپ ہیں معروف شاعر فیاض احمد فیض، تاریخی نظمیں خوب کہتے ہیں..... آپ ہیں مشہور افسانہ نگار ارشاد عظیم، عورتوں کی نفسیات آپ کا خاص موضوع ہے..... آپ ہیں فٹ بال کے مشہور اور باکمال کھلاڑی..... آپ ہیں رینو چٹرجی، ڈانسر، کتھا کلی کی ماہر..... اور آپ ہیں مس فرحت..... یوتھ کلب کی روح رواں اور.....'' اور وہ فرحت کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہ فرحت کو سدا سے ہی جانتا ہو۔ اسے اپنی طرف انہماک اور اشتیاق سے دیکھتے ہوئے محسوس کر کے فرحت جھینپ گئی۔ نظریں نیچی کر لیں، شاہد نے بھی دونوں کی اس کیفیت کو محسوس کیا۔

''آپ تو فرحت کو اس طرح دیکھ رہے ہیں، جیسے انہیں جانتے ہوں؟'' وہ خاموش رہا۔ فرحت بھی خاموش رہی۔ شاہد نے دونوں کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور مسکرا کر رہ گیا۔

دوستوں کی بھیڑ اور نت نئی مصروفیتوں میں اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہونے لگا۔ غموں کی آنچ سرد ہونے لگی۔ فرحت کے قرب نے اس کے اندر جینے کا نیا حوصلہ پیدا کر دیا۔ گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ فرحت بھی اس میں دلچسپی لینے لگی۔ دونوں چند ہی دنوں میں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ان دونوں کو قریب لانے میں شاہد نے اہم رول ادا کیا اور اب تو فرحت کے بغیر اسے چین نہ تھا اور نہ اس کے بغیر فرحت کو۔

وہ فرحت کی محبت میں اس قدر کھو گیا تھا کہ اسے اپنے اردگرد کی بھی خبر نہ تھی۔ وہ دوستوں کے درمیان فرحت کو تحفے دینے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ لوگوں کی موجودگی میں بھی فرحت کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بیٹھا لیتا، وہ محسوس بھی نہ کرتا کہ اس کی اس حرکت کا غلط مطلب بھی لگایا جا سکتا ہے اور کبھی کبھی جب فرحت دوستوں کی باتوں پر بے باک قہقہہ لگاتی تو وہ ڈانٹ بھی دیا کرتا تھا اور فرحت اس کی ڈانٹ کو اس طرح سہ جاتی جیسے وہ اس کی پابند ہو، اس پر اس کا اختیار ہو۔

''کیا ہے یہ؟''

اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ دیکھ کر فرحت نے دریافت کیا۔

''کل بازار گیا تھا۔ کچھ کپڑے لینے تھے۔ یہ شلوار سوٹ مجھے پسند آ گیا۔ کل اسے ہی پہن کر آنا!'' اس نے پیکٹ فرحت کو دیتے ہوئے ایک محبت آمیز چانٹا اس کے سر پر لگا دیا۔

''کل تم ارچنا کی نکلس کی تعریف کر رہی تھی نا، ویسی ہی لے آیا ہوں۔ آؤ پہنا دوں!'' اس نے کلب میں بہت سارے لوگوں کا خیال کیے بغیر اپنے ہاتھوں فرحت کے گلے میں نکلس پہنا دیا۔

''اب اتنا بھی فیشن کیا کہ چوڑیاں نہ پہنی جائیں، لڑکیوں کی خالی کلائیاں اچھی نہیں لگتیں، یہ سونے کی ہیں، دونوں کلائیوں میں دو دو ابھی پہن لو۔''

''میری فرحت، تمہارا کلب آنا مجھے اچھا نہیں لگتا، لیکن جب آتی ہی ہو تو ایسا لباس پہن کر مت آیا کرو جس سے جسم کھلا نظر آئے، مجھے شرم آتی ہے۔''

اس کی پرکشش شخصیت اور بے لوث محبت نے جیسے فرحت پر جادو کر دیا تھا۔ وہ اس سے اس قدر متاثر تھی کہ اس کی بات خاموشی سے سن لیتی۔ وہی کرتی جو وہ کہتا۔ وہ اکثر سوچنے لگتی کتنا معصوم ہے وہ اور اس کا پیار، اگر اسے میرے جوان جسم کی طلب ہوتی تو وہ مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر اتنا دباتا کہ میری ہڈیاں چٹخ جاتیں، اگر اسے میری گھنیری زلفوں سے محبت ہوتی تو میرے شانے پر سر رکھ کر مدہوش ہو جاتا۔ اگر وہ میری آنکھوں کا گرویدہ ہوتا تو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا:

''فرحت ڈارلنگ مجھے ان آنکھوں سے اتنا پلا دو کہ مست و بے خود ہو جاؤں۔'' میں تو خود اس کی اتنی گرویدہ ہو گئی ہوں کہ اسے

PDF Compressor Free Version

روک بھی نہ سکتی، ٹوک بھی نہ سکتی۔ کتنا عظیم ہے وہ، کتنی عظیم ہے اس کی محبت، محبت کی اعلیٰ قدروں سے آراستہ۔

اس کے باوجود فرحت کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ اسے اپنی بانہوں میں لے کر کہتا:

''میری فرحت، تمہارے بغیر میری زندگی کتنی بے کیف اور ویران تھی، تم کیا آئیں، بہار آ گئی'' اور اس کے چہرے کے قریب، بہت قریب جھک کر اس کے کانوں میں سرگوشی کرتا:

''فرحت ڈارلنگ تمہارے یہ لہکتے ہوئے شگفتہ رخسار جیسے طلوع ہوتا ہوا آفتاب اور یہ باریک ہونٹوں کی باریک شکنیں جیسے آفتاب کی سنہری کرنیں پلیز.....'' اور وہ خود بخود شرما جاتی۔ پہروں ان لطیف احساسات میں ڈوبی رہتی۔

شام ہو چکی تھی، دن بھر کی جھلس دینے والی گرمی کے بعد موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ نیلے آسمان پر سیاہ اور سفید بادل منڈلا رہے تھے۔ خنک اور فرحت بخش ہوائیں چل رہی تھیں، کلب کے لان کی کیاریوں میں رنگ برنگ کے پھول شاخوں پر جھوم رہے تھے۔ فرحت موسم کی اس تبدیلی سے اپنے اندر بھی فرحت محسوس کر رہی تھی۔ وہ لان میں بنے مرمری تخت پر نیم دراز موسم کی سحر انگیزیوں سے لطف اندوز ہوتی ہوئی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے اس کے شانہ پر سر رکھ کر محبت کی حسین وادیوں میں کھو جانے کے سپنے دیکھ رہی تھی کہ اپنے قریب قدموں کی آہٹ محسوس کر کے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سامنے ہی کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

''اکیلے یہاں کیا کر رہی ہو؟'' فرحت نے اسے دیکھا۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس طرح انگڑائی لی کہ آنچل شانے سے ڈھلک گیا۔ اس نے فرحت کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔

''آؤ اندر چلیں۔'' وہ پیچھے کی طرف مڑ گیا۔ فرحت نے آگے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس طرح جھٹکا دیا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور فرحت کے پہلو میں اس طرح گرا کہ اس کا جسم فرحت سے ٹکرا گیا۔ وہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ فرحت نے بازوؤں کو اس کے گلے میں ڈال کر اپنی طرف کھینچ لیا اور بولی:

''آج تو وہ سب کچھ کہہ دو..... جو سننے کے لئے میں ایک مدت سے تڑپ رہی ہوں۔'' اس نے فرحت کو بری طرح جھٹک دیا۔ وہ مرمریں تخت پر گر پڑی۔

''بدتمیز، میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنا گر سکتی ہو۔''

فرحت تیزی سے کھڑی ہو گئی اور ایک بھرپور تھپڑ اس کے بائیں گال پر جڑتی ہوئی خشمگیں لہجے میں بولی:

''اور مجھے بھی یہ کہاں معلوم تھا کہ تم مرد نہیں ہو۔'' اور وہ خود کو سنبھالتی ہوئی کلب کی طرف بڑھ گئی۔ کوشش کے باوجود وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکا۔ مرمری تخت پر بیٹھا دیر تک روتا رہا۔ بھولی بسری یادیں اسے مضطرب کرتی رہیں۔ اسے روتا دیکھ کر بادلوں کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔ وہ اٹھا اور کلب کی طرف چل پڑا۔ اسے اپنی فرحت شدت سے یاد آ رہی تھی۔

ہال میں موسیقی کی سحر انگیز دھن لہرا رہی تھی، میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ قہقہوں اور مسکراہٹوں کے درمیان یا تو شراب، کافی اور کولڈ ڈرنک سے اپنی اپنی پیاس بجھا رہے تھے یا اپنے قریب بیٹھی سیمیں پیکروں کی آنکھوں کی گہری جھیلوں سے اور حسن و شباب کے امڈتے چشموں سے۔

''کہاں تھے، میں بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں؟'' شاہد نے کہا۔ شاہد کو جواب دیئے بغیر وہ ویٹر سے مخاطب ہوا:

''رم.....!''

''یہ کیا، تم نے تو قسم کھائی تھی کہ پھر کبھی شراب نہیں پیو گے'' شاہد کے لہجہ میں حیرت تھی۔ ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی، کچھ بولا نہیں۔

''لیکن میں تمہیں نہیں پینے دوں گا!''

''شاہد، موت کا جام پینے سے تو اچھا ہے کہ شراب ہی پی کر وقت کو ٹال دیا جائے۔ آج پھر مجھے اتنا پی لینے دو کہ میں سب کچھ بھول جاؤں۔ خود کو بھی اور تمہیں بھی، ورنہ گزرے ہوئے لمحے مجھے جینے نہ دیں گے، اف!'' اور شاہد نے محسوس کیا کہ ضرور کوئی سنگین بات ہو گئی ہو گی، جب ہی تو فرحت بھی ادھر گم صم بیٹھی ہے۔ اس نے یہی مناسب

PDF Compressor Free Version

سمجھا کہ اس وقت اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور جب اس نے تیسرا پیگ خالی کر کے ویٹر کو اور لانے کو کہا تو شاہد نے ویٹر کو منع کر دیا کہ اب اور نہ لائے۔

''مت روکو شاہد، لانے دو اسے''

''نہیں اب اور نہیں، بہت ہو چکا''

''کہاں بہت ہوا میرے دوست، ابھی تو میں زندگی کی تلخی محسوس کر رہا ہوں'' اور اس نے میز پر دائرے کی شکل میں پھیلے اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان سر رکھ دیا۔

شاہد اسے دیکھتا رہا۔ کچھ فاصلہ پر تنہا بیٹھی فرحت کی طرف بھی اس کی نگاہیں بار بار اٹھ جاتی تھیں۔ شاہد آنکھوں ہی آنکھوں میں فرحت کو کتنے اشارے کر چکا تھا اور ہر بار فرحت اس کے اشارے کو نظر انداز کر کے منھ دوسری طرف پھیر لیتی تھی۔ شاہد اسے ایسی حالت میں چھوڑ کر حالات سے واقفیت کے لئے فرحت تک جانے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھا ہی تھا کہ اس نے میز سے سر اٹھایا اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا:

''آج میں کلب سے آخری بار تمہارے ساتھ ہی نکلوں گا، لیکن ذرا ٹھہرو، میں فرحت سے بھی آخری بار مل لوں، آج ایک بار پھر وہ کبھی نہ منانے کے لئے مجھ سے روٹھ گئی ہے۔''

شاہد خاموش رہا اور وہ لڑکھڑاتے قدموں کو سنبھالتا فرحت کے قریب آیا۔ اسے دیکھ کر فرحت نے منھ پھیر لیا۔ اس نے غور سے فرحت کو دیکھتے ہوئے کہا:

''فرحت تم میری طرف نہیں، میری آنکھوں کی طرف دیکھو، ان میں کتنی بیچارگی ہے۔ ان آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھو، ان میں کتنی تڑپ ہے۔ میری آواز تو سنو کہ میری آواز میں کتنا درد ہے، لیکن نہیں، تم تو وہاں ہو جہاں سے میرے آنسوؤں کی تڑپ نہیں دیکھ سکتیں، میری آواز کا درد محسوس نہیں کر سکتیں، حالاں کہ تم نے اس وقت مجھے ہی پکارا ہوگا جب کالج سے آتے ہوئے تمہارا رکشہ برق رفتار سے ٹرک کی زد میں آ گیا ہوگا اور خون اور خاک میں لتھڑی ہوئی ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لینے سے پہلے اپنے گرد اکٹھا ہو جانے والی بھیڑ میں تمہاری آنکھیں مجھے ہی ڈھونڈ رہی ہوں گی اور پھر تم ایسی خاموش ہوئیں کہ میں چیختا رہا، فرحت! فرحت! کہتا ہوا تمہیں جھنجھوڑتا رہا، مگر میری آواز تم تک نہ پہنچی۔ تم ایسی روپوش ہوئیں کہ میں تمہیں ڈھونڈتا رہا، بھٹکتا رہا، بہکتا رہا اور ایک دن تم مجھے مل گئیں۔ میں پچھلی تمام باتوں کو اور غم انگیز روز شب کو ذہن سے جھٹک کر خوشگوار ماضی کی طرف لوٹ جانے کی سعی کرنے لگا۔ فرحت، جب شاہد نے پہلی بار تم سے ملایا تو میں نے محسوس کیا کہ میری خوشیاں مجھے واپس مل گئی ہیں۔ میرے رستے ہوئے دل کے زخموں کو مرہم مل گیا ہے۔ میری کھوئی ہوئی فرحت مجھے مل گئی ہے، لیکن آج ایک بار پھر میری فرحت کھو گئی کبھی نہ ملنے کے لئے۔''

اس نے سامنے کھڑی ہوئی فرحت کی طرف ایک قدم بڑھایا اور کہنے لگا: ''نام کی مماثلت نے مجھ میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی تھی، تم ہی سوچو فرحت، اس بھائی کو کیسے چین آئے گا، جس نے ماں باپ کی شفقتوں سے محروم اپنی معصوم چھوٹی بہن کو اولاد کی طرح پال کر بڑا کیا ہو۔''

اس کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز کنستروں کے جگر چیر گئی۔ کتنے ہی چھلکتے ہوئے پیمانے ہاتھوں سے چھوٹ گئے۔ مسکراتے ہوئے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کتنے ہی دمکتے ہوئے چہرے فق ہو گئے۔ کتنی ہی پلکیں نم ہو گئیں۔

وہ اپنے اندر کے درد اور کرب کی تاب نہ لا کر گرنے ہی والا تھا کہ شاہد نے اسے سنبھال لیا اور دوسرے ہی لمحہ اس کے سینے سے لگی فرحت بلک رہی تھی: ''مجھے معاف کر دیجئے بھائی جان!'' اور وہ فرحت کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے، خود کو سنبھالتے ہوئے کہہ رہا تھا:

''نہ رو فرحت، نہ رو، تو تو میری وہی بہن ہے جو کھو گئی تھی۔''

❁❁❁

☆ خاموشی علم کا زیور ہے اور جاہل کی جہالت کا پردہ۔

☆ میانہ روی سے دشمن مغلوب ہو جاتے ہیں۔

☆ اس شخص کو کبھی موت نہیں آتی جو علم کو زندگی بخشتا ہے۔

☆ پاکیزگی دنیا کی خواہشات ٹھکرانے سے ہوتی ہے۔

☆ بھلائی کی خواہش برائی کی خواہش کو بادیتی ہے۔

راجہ یوسف

Anchidora, Anantnag, Kashmir, JK 192101

مہمیز

یہ آفس نہیں ایک بڑا ڈیکوریٹیڈ شوروم لگ رہا تھا۔ فرش پر مہنگا کشمیری قالین بچھایا گیا تھا۔ اُس پر قیمتی فرنیچر، دیواروں پر قد آدم پینٹنگس، کھڑکیوں پر ریشم کے دبیز پردے۔ ایک طرف ڈینلوپ کے صوفے رکھے گئے تھے، جن کے نرم تکیوں پر کشمیری چین سٹیچ کے غلاف چڑھے تھے۔ مغل آرکیٹکچر میں بنا دروازہ۔ دروازے کے پائیوں پر چڑھی بیلیں اور گملوں میں سجے عشقِ پیچان کے پھول کمرے کا حسن دوبالا کر رہے تھے۔ سامنے کھلی کھڑکی کے شیشوں کے اُس پار برف پوش پہاڑی سے گرتا آبشار اردگرد کے ماحول کو رومان انگیز بنا رہا تھا۔ کمرے میں ایک طرف بڑی آبنوسی میز سجائی گئی تھی، جس پر صرف دو فائل پڑے تھے اور میز کے پیچھے ریوالونگ چیر پر عرفان بیٹھا تھا۔ عرفان کی شاندار شخصیت کو بلیک دھاری دار سوٹ اور اندر پہنی سفید کالر والی قمیص نے اور پروقار بنا دیا تھا۔

میں آج پورے چار سال کے بعد اس کے روبرو بیٹھا تھا، اُسے دیکھ کر مجھے اپنی غربت اور کم مائیگی کا زبردست احساس ہو رہا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھ کر بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ شاید وہ میری سراسیمگی نوٹ بھی کر لیتا، لیکن جب سے میں آیا تھا، وہ لگاتار فون پر کسی کو ہدایات دے رہا تھا۔ چائے کی چسکیوں میں خود کو الجھا کر مجھے سنبھلنے کا اچھا موقع مل رہا تھا۔ مجھے اس کا چہرہ تناؤ سے بھرا اور کھنچا کھنچا سا لگ رہا تھا۔ یہ تناؤ مجھے اس کی ذہنی پریشانی اور دل کی اداسی کے سبب لگ رہا تھا اور میں سمجھ رہا تھا کہ اس کے چہرے پر یہ اداسی کیوں ہے۔ وہ تاشی تھی، جو چار سال پہلے اس کی زندگی میں بہار بن کر آ گئی تھی لیکن اُس کا وہ پیار صرف چار دن ہی رہا، پھر اپنے ہاتھوں عرفان کا دل ویران کر کے چلی گئی۔

دو دہائیوں سے زیادہ مخدوش حالات کے بعد اب کشمیر کچھ سنبھل رہا تھا۔ سیاح پھر سے کشمیر کا رخ کر رہے تھے۔ پچھلے پچیس برسوں میں ہم کیا کچھ کھو چکے تھے۔ اب اُس کا کسی کو غم نہیں تھا۔ اگر کوئی غم تھا تو وہ بیکاری، بے روزگاری، غربت اور افلاس کا غم تھا۔ میرا باپ گھوڑا بان تھا۔ ہمارے پاس کئی خچر اور گھوڑے تھے، جن کو لے کر میرا باپ پہلگام چلا جاتا تھا اور ایک سیزن میں پورے سال کا خرچہ کما لیتا تھا، پھر سارے سیزن حالات کے شکار ہو گئے اور یہاں مستقلاً بس ایک ہی سیزن جم کر بیٹھ گیا، جس میں ہم اپنا سب کچھ کھو بیٹھے۔ جب تک میرا بچپن گیا اور میں جوان ہو گیا۔ ہم اپنے سبھی خچر اور گھوڑے بیچ کر کھا چکے تھے۔ اب گھر میں ہر طرف غربت، افلاس اور پریشانیاں ڈیرا ڈالے ہوئی تھیں۔

حالات بہتر ہوئے تو ہم نے قرض لے کر ایک خچر خرید لیا اور میرا باپ اُسے لے کر پہلگام چلا گیا، لیکن اب اس کی ٹانگوں میں وہ سکت نہ تھی کہ وہ بائی سرن جیسی پہاڑی پر سیاح کو لے کر جا سکتا، یا چندن واڑی تک گھوڑے کی لگام پکڑ سکتا۔

آخر باپ کی ناتوانی اور گھر کی تنگی حالت نے مجھے مجبور کر دیا اور میں اپنا اکلوتا خچر لے کر پہلگام چلا گیا۔ کام اچھا چل نکلا تھا تو اگلے سال میرے پاس دو خچر تھے، اب ہمارے غموں کا کچھ کچھ مداوا ہو رہا تھا۔

عرفان میرے بچپن کا دوست تھا۔ میرے پڑوس میں رہتا تھا۔ ان کے گھر کے حالات بھی کچھ اچھے نہ تھے۔ اس کا باپ بشیر احمد بھی بازار میں ٹھیلہ لگاتا تھا، لیکن جب یہاں کے حالات خراب ہو گئے، روز روز ہڑتالیں، ہنگامے، گولیاں اور مار دھاڑ ہونے لگی، معصوم اور بے گناہ لوگ بلا وجہ مرتے گئے یا مارے گئے، تو ایک دن کراس فائرنگ میں عرفان کا باپ بھی اپنی جان گنوا بیٹھا۔ وہ اپنا ٹھیلہ لے کر بھاگ رہا تھا، دکاندار دکانوں کے شٹر گرا رہے تھے، گھر والے دروازے بند کر کے

PDF Compressor Free Version

اندر سے لاک کر رہے تھے، لوگ اپنا اپنا سامان اور سوداسلف چھوڑ کے بھاگ رہے تھے۔ دائیں، بائیں سے گولیاں چل رہی تھیں، اسی بھاگ دوڑ میں ایک گولی بشیر احمد کو بھی لگی تھی۔ وہ کئی بار گرا اور اٹھا، اٹھ کر پھر گر جاتا تھا، وہ مدد کے لئے بہت چیخا، چلایا، پر کوئی مددگار نہ تھا۔ پیاس سے اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔

وہ خون میں لت پت گھسٹتے گھسٹتے گٹر تک آ گیا تھا، جونہی اس نے اپنا ہاتھ گٹر میں ڈالا۔ اس کے سر پر بندوق کا بٹ مارا گیا۔ جسم میں باقی بچا خون فوارے کی طرح اوپر آ رہا تھا اور مٹی میں مل رہا تھا۔ اس کی لاش خاک اور خون میں لت پت ہوگئی تھی اور ہاتھ کی انگلیاں گٹر کا پانی چھو رہی تھیں۔

تب عرفان بہت چھوٹا تھا، لیکن اس کی ماں نے ہمت نہیں ہاری، گائے کا دودھ بیچ کر گھر چلاتی رہی اور عرفان کو بھی پڑھاتی رہی۔ جب ہم محلے کے سارے لڑکے پڑھائی سے بھاگ رہے تھے اور ہلکا پھلکا کام دھندا کرنے لگے تھے، عرفان یونیورسٹی جاتا رہا۔

آج کل وہ ایم اے کا امتحان دے کر فارغ بیٹھا تھا اور ریزلٹ کا انتظار کر رہا تھا، میں اس کو اپنے ساتھ پہلگام لایا تھا۔ سوچا کہ وہ چند دن میرے ساتھ رہ کر مفت میں پہلگام کی سیر کرے گا۔ عرفان تو جیسے پہلگام کا دیوانہ ہی ہوگیا تھا۔ وہ صبح ہی صبح نالہ لدر کے کنارے نکل جاتا تھا اور بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتے اور اچھلتے پانی کے تیز بہاؤ کا مزا لیتا تھا۔ لدر کے کنارے سرسبز مخملی گھاس پر شبنمی قطرے سورج کی کرنوں میں چمکتے رہتے ہیں، وہ یہاں آ کر ننگے پاؤں دوڑتا رہتا تھا۔ شام کے سرمئی رنگ میں دیوداروں کے لمبے سائے دلکش نظارہ پیش کرتے ہیں اور ہوا کی خنکی جسم وجان میں نئی تازگی بھر دیتی ہے۔ عرفان گھنٹوں یہاں بیٹھ کر جیسے پہلگام کی ساری مستیاں اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش میں تھا۔ دن میں ہم اپنے گھوڑوں پر ٹورسٹ گھماتے رہتے تھے اور میں عرفان کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔

آج ساؤتھ انڈیا سے آئی ہوئی ایک بڑی فیملی یہاں کے تین ستارہ ہوٹل میں ٹھہری تھی، جن کو بارہ گھوڑے چاہئے تھے۔ ہم تین گھوڑے والے ہوٹل پہنچ گئے۔ میں نے عرفان کو بھی ساتھ لیا تھا۔ فیملی کا ہیڈ سری واستوا صحت مند آدمی لگ رہا تھا۔ جب وہ اپنے اپنے گھوڑے پسند کرنے لگے تو اس وقت پتہ چلا کہ صرف سری واستوا جی ہی ہندی بولتے ہیں، وہ بھی ٹوٹی پھوٹی۔ باقی سارے لوگ انگریزی یا کوئی دوسری ہی زبان بولتے تھے۔ ویسے پہلگام کے سبھی گھوڑے والے دنیا کی لگ بھگ ساری زبانیں اپنے مخصوص اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بول ہی دیتے ہیں، لیکن ہم ابھی اناڑی تھے۔ ابھی گھوڑا بانی میں ہمارا یہ دوسرا ہی سال تھا، اب جو ہم پھنسے تھے، وہ بھی لڑکیوں اور بچوں کے بیچ میں برے پھنسے تھے۔ ہم ان کی باتیں سمجھ نہیں پا رہے تھے اور وہ ہمارے اشارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم سبھی پریشان تھے، عرفان مزے لے رہا تھا، وہ لگاتار ہنستا جا رہا تھا اور مجھے بڑا غصہ آ رہا تھا۔ آخر اس کو ہماری لاچارگی پر ترس آ ہی گیا، تو اس نے شفاف انگریزی میں ان کے ساتھ بات چیت شروع کر دی، وہ ان کو کشمیر کے بارے میں اور خاص طور سے پہلگام کے بارے میں ایک ماہر ٹورسٹ گائیڈ کی طرح جانکاری دے رہا تھا اور میرا سینہ فخر سے پھولتا جا رہا تھا، میں اپنے گھوڑے بان ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ یہ میرا دوست بہت پڑھا لکھا ہے اور قابل بھی ہے۔

''ابھی آپ نے پہلگام میں دیکھا ہی کیا ہے۔ ابھی آپ شکارگاہ کہاں گئے، بائسرن، آڑو، چندن واڑی، بے تاب ویلی اور گوالف کورس کہاں دیکھا ہے۔ ابھی آپ نے لدر کے اچھلتے پانیوں میں کھڑے ہو کر فوٹو کہاں کھنچوائے ہیں۔ دیوداروں کی بھینی بھینی خوشبو سے محظوظ کہاں ہوئے ہیں۔'' عرفان نے ان کو پہلگام کی ایسی ایسی تعریفیں بتا دیں کہ بچوں اور لڑکیوں نے اپنے پہلگام کے پروگرام میں مزید تین دن بڑھا دیئے۔

اب باتوں باتوں میں یہ پتہ لگ چکا تھا کہ سری واستوا کے ساتھ اس کے دو بیٹے آشوتوش اور مانو، دو بہوئیں رتو اور سرلا، اس کی مڈل ایج بیٹی راشی (جس کی کسی وجہ سے شادی نہیں ہو سکی تھی) کے علاوہ بڑے بیٹے آشوتوش کی تین جوان بیٹیاں اور چھوٹے بیٹے مانو کے دو بچے ساتھ تھے۔ ان کے علاوہ چالیس پینتالیس سالہ ان کا نوکر تھا۔ سری واستوا وہاں کا بڑا بزنس مین تھا اور اس کے دونوں بیٹے سافٹ ویر کمپنی چلا رہے

PDF Compressor Free Version

تھے۔ تین بہنوں میں منجھلی بہن کا عجیب سا نام تھا "تاشی" ایسے نام اکثر چینی یا جاپانی لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔ تب ان کی ہی زبانی یہ پتہ چلا کہ جس دن یہ پیدا ہوئی تھی، اسی دن اس کے باپ کو ایک بڑا سافٹ ویر حاصل کرنے میں کامیابی مل گئی تھی، سافٹ ویر کا نام تاشی تھا، اس لئے انہوں نے اپنی اس بیٹی کا نام اسی سافٹ ویر کے نام پر تاشی رکھ دیا تھا۔

"ہمارے گھر میں بوا کی حکمرانی چلتی ہے۔ یہ جو کچھ کہے گی وہی بنے گا۔"

یہ بات تاشی نے اپنی بوا راشی کے بارے میں کہی تھی۔ راشی اپنے بھائیوں کی چہیتی اور لڑکیوں کی دوست لگ رہی تھی۔ تاشی گھر کی لاڈلی تھی، تینوں بہنوں میں سب سے خوبصورت، ذہین اور بے باک تھی۔ وہ عرفان کے بہت قریب جا رہی تھی۔ بلاوجہ ہی وہ عرفان سے سوال پوچھتی رہتی تھی، کشمیر کے بارے میں طرح طرح کی جانکاری حاصل کرنے کے بہانے عرفان کے ساتھ چپٹی رہتی تھی۔ راشی اور مانو بھی سوالات پوچھتے رہتے تھے، لیکن مانو کی باتیں زیادہ تر بزنس کے بارے میں ہوتی تھیں، جہاں عرفان کورہ تھا، کورہ تو عرفان ان کے بچوں کے سامنے بھی لگتا تھا۔ جتنا وہ جدید ٹیکنالوجی کے قریب تھے، عرفان اتنا ہی اُس سے کوسوں دور تھا۔ وہ بچوں کے سامنے بہت زیادہ احساسِ کمتری کا شکار ہو رہا تھا، لیکن تاشی اُسے خفت اٹھانے کا موقع نہیں دیتی تھی۔ تاشی کے سپورٹ میں بوا بھی ساتھ ساتھ رہتی تھی۔

"یار یہ لڑکی تو تمہاری دیوانی ہی ہوگئی ہے۔ تمہارے ساتھ چپکی رہتی ہے۔" یہ بات میں شام کی نون چائے پیتے پیتے عرفان کو بتا رہا تھا۔ جب ہم ڈیرے پر واپس آ گئے تھے۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے حامد ڈیر۔ یہ بہت امیر لوگ ہیں۔ زیادہ دن یاد نہیں رکھیں گے۔ بس جب تک یہ لوگ پہلگام میں ہیں، پھر یہ کہاں اور ہم کہاں۔" عرفان نے بڑے اداس لہجے میں کہا۔

"لیکن میں نے تاشی کی آنکھوں میں تیرے لئے ایک عجیب سی کشش دیکھی ہے۔ وہ جب بھی تیری طرف دیکھتی ہے، اس کی آنکھوں میں مجھے تیرے لئے ڈھیر سارا پیار نظر آتا ہے۔"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"میں کہتا ہوں پٹاؤ اس کو۔ یہ بڑے امیر لوگ ہیں۔ پیسے والے ہیں۔ تیرے دن بدل جائیں گے۔"

میں نے زوردار قہقہہ لگاتے کہا۔

"آسان نہیں ہے یار۔ پیسہ اتنی آسانی سے کہاں ملتا ہے۔"

عرفان نے لنگڑی گھوڑی کے بارے ہوئے مالک کی طرح کہا، جس کی گھوڑی کو تیز طرار ٹورسٹ ریجکٹ کر کے دوسرے کے خچر پر سواری کرتا ہے۔ مجھ سے اس کی یہ ناامیدی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میں نے اس کی ہمت بندھانے کے لئے کہا:

"بہت آسان ہے میرے بھائی۔ بس انسان کو موقع ملنا چاہئے، جس طرح تم کوشل رہا ہے۔ کم سن باکرہ اور ننگ گھوڑی میں زیادہ فرق نہیں ہوتا ہے۔ پٹایا اور بس..... میں بتاتا ہوں کیسے..... گھوڑی کو پہلے پیار سے سدھاؤ۔ پھر دبچی کس لو..... اوپر زین ڈال دو..... اپنے پیر رکابوں میں پھنسا دو..... پھر مہمیز لگا دو..... اب گھوڑی سرپٹ دوڑے گی..... پر میری ایک اور بات بھی یاد رکھنا۔ لگام اپنے ہاتھ میں کس کے رکھنا، پھر گھوڑی کو جدھر موڑنا چاہو گے، وہ مڑتی جائے گی۔ سوار جتنا اچھا اور تجربہ کار ہوتا ہے، اس کی گھوڑی اُتنی ہی مست رفتار سے دوڑتی رہتی ہے۔"

وہ ساری رات عرفان کے سپنوں کی رات تھی۔ تاشی ایک پل کے لئے بھی اس کے سپنوں سے ادھر اُدھر نہیں گئی تھی۔ وہ ساری رات تاشی کے ساتھ چندن واڑی کی برفیلی پھسلن پر پھسلتا جا رہا تھا۔ کبھی وہ آڑو کے گھنے دیودواروں کے بیچ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، کبھی بیتاب ویلی کی مخملی گھاس پر خراماں خراماں چہل قدمی کر رہے تھے، کبھی لدر کے کنارے اچھلتی لہروں سے کھیلتے جا رہے تھے۔ تاشی نے ایک پل بھی اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ صبح جب وہ دیر تک نیند سے نہیں جاگا تو میں نے اُسے زبردستی اٹھا دیا۔ وہ مسکرا کر مجھے دیکھ رہا تھا، پھر اس نے بتا دیا کہ وہ میری باتوں اور تاشی کے خیال سے رات بھر سو نہیں پایا تھا۔

آج وہ لوگ واپس جا رہے تھے۔ میں عرفان کو ساتھ لے کر ہوٹل پہنچ گیا، میرے ساتھ میرا گھوڑا تھا۔ وہ گاڑیوں میں سامان لاد رہے تھے، عورتیں سامان چیک کر رہی تھیں۔

PDF Compressor Free Version

''عرفان تم! اس وقت؟'' بوا نے عرفان کو دیکھ کر حیرانگی سے پوچھا، تو سبھی کا دھیان ہماری طرف گیا۔ وہ سبھی ہم کو دیکھ کر خوش ہو گئے تھے، لیکن عرفان کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔

''وہ کیا ہے کہ عرفان آپ لوگوں کے لئے کچھ گفٹس لایا تھا۔ ارے عرفان دے دو نا.....'' عرفان جو تاشی کو اداس نظروں سے دیکھ کر نظریں جھکائے کھڑا تھا، میرے بلانے پر ہچکچا رہا تھا، پھر جلدی جلدی گھوڑے سے سامان اتارنے لگا۔ میں نے بھی اس کی مدد کی۔ ہم نے ان کو سیب کی دو پیٹیاں، کچھ آخروٹ اور بادام دے دیئے۔ وہ بہت زیادہ خوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے ان چیزوں کے پیسے دیئے تھے جو ہم نے واپس کر دیئے۔ جب تک باقی لوگ گاڑیوں میں بیٹھنے لگے، تاشی اور بوا عرفان کے قریب ہی کھڑے اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔

عرفان نے اچھے نمبروں کے ساتھ ایم۔اے پاس کیا اور مزید پڑھائی کے لئے ریاست سے باہر چلا گیا۔ ان دنوں پہلگام میں سیاحوں کا کافی رش رہتا تھا، اس لئے میں عرفان سے مل نہیں سکا تھا۔ یہ اگلے سال کی دلکش صبح تھی جب مجھے ہوٹل تھری اسٹار سے بلاوا آیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے، کوئی پچھلے سال کا سیاح اگر نئے سال پھر گھومنے آجاتا ہے تو زیادہ تر وہ پرانی جگہ ہی رہنا پسند کرتا ہے اور پھر وہ اکثر ان ہی گھوڑے بانوں کو بلاتے ہیں، جن کے ساتھ وہ پچھلے سال گھومے ہوں۔ میں بھی یہی سوچ کر جا رہا تھا کہ شاید کوئی پرانی پارٹی پھر سے گھومنے آئی ہے۔ ہوٹل پہنچ کے میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے وہاں بوا کو دیکھا، پھر تاشی اور اس کا بے ڈھنگا شوہر۔ سب لوگ میرے ساتھ بڑے تپاک سے ملے، پھر بوا نے تعارف کرایا:

''یہ ارجن ہے، تاشی کا ہسبنڈ'' جب ارجن نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ میرے اندر کہیں سے بہت بڑا چھناکا سا ہوا۔ میرے اندر بہت زیادہ ٹوٹ پھوٹ ہو گئی۔ سامنے عرفان کا اداس اور بے بس چہرہ آ گیا۔ آج پھر غریب کی محبت ہار چکی تھی۔ آج پھر نادار اور مفلس کا مذاق اُڑایا جا رہا تھا۔ میں اپنے غریب دوست کے لئے بہت اداس تھا، بہت زیادہ غمگین تھا۔

میں ان کو پورا پہلگام گھماتا رہا۔ تاشی ارجن کے ساتھ بہت خوش لگ رہی تھی۔ ہنسی کی کلکاریاں بھر رہی تھی۔ ہرنی کی طرح اچھل کود کر رہی تھی۔ لدر کے کنارے ارجن کے کندھے پر اپنے بال بکھرا کر ویڈیو بنوا رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی مجھ سے عرفان کے بارے میں نہیں پوچھا تھا، جس وجہ سے مجھے اس پر بڑا غصہ آ رہا تھا، میں پھنکار رہا تھا۔

''ہونہہ، بڑی آئی کالی گھوڑی.....!'' وہ پہلگام میں دو دن گھومتے رہے۔ جگہ جگہ فوٹو کھنچوائے، ویڈیوز بنوائے اور مجھے اچھا خاصا پیسہ دے کر چلے بھی گئے، لیکن مجھے ان کے آنے یا ان کے جانے سے کوئی مسرت نہیں ہوئی تھی، بلکہ وہ مجھے بہت زیادہ غمزدہ کر کے چلے گئے تھے۔ میرا دوست عرفان جانے کہاں تھا۔ کیا خبر وہ تاشی کی بے وفائی سے آشنا تھا بھی کہ نہیں۔

ابھی چند دن پہلے ہی مجھے پتہ چلا ہے کہ عرفان نے ہوٹل گرین راج خریدا ہے۔ میں حیران تھا، لیکن خوشی بھی ہو رہی تھی۔ مجھے یقین سا ہو رہا تھا کہ یہ سب تاشی نے کیا ہے۔ اب شاید تاشی کو یہ احساس ہوا ہوگا کی عرفان کو دھوکہ دے کر اس نے اچھا نہیں کیا ہے۔ عرفان کی مدد کر کے اس نے اپنے پیار کا قرضہ چکایا ہوگا۔ کچھ تو میرے دل کو ٹھنڈک مل رہی تھی۔

آج میں عرفان کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہم نے چائے بھی پی لی، لیکن وہ پریشان تھا۔ وہ لگاتار فون کر رہا تھا اور کسی کو ہدایت دیتا جا رہا تھا۔ اس کی باتوں سے میں اتنا جان چکا تھا کہ کوئی میڈم ائیر پورٹ سے آ رہی ہے۔ ہوٹل کی گاڑی اسے لانے گئی ہے، جو پہلگام کے نزدیک پہنچ کر ٹریفک جام میں پھنس چکی ہے۔ میں نے عرفان کی آنکھوں میں چمک سی دیکھی، وہ دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ کھلا۔

''ہائے ڈارلنگ'' کہہ کر جو اندر آ گئی، اس کو دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ عرفان کے گلے لگ گئی۔ عرفان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ دونوں میری طرف آ رہے تھے اور میں ہکا بکا انہی کو دیکھ رہا تھا۔

''ہائے حامد کیسے ہو''

(بقیہ ص ۶۶ پر)

PDF Compressor Free Version

منظومات

علیم صبا نویدی

No. 192/266, Triplicane High Road, Flat No. 16, Second Floor

Rice Mandi Street, Chennai-60005 (Mob.9840361399)

تین سطری نظمیں

دنیا جلتا گھر
لوگ سلگتے رہتے ہیں
وقت تماشائی

☆

یہ کائنات
مہذب چیلوں کا غول
روزِ اوّل کا ثبوت

☆

کالا پن دل میں
چہروں پہ دینی غارہ
ششدر آئینہ

☆

خدا قید
مخلوق آزاد
اور لہو میں سفیدی رقصاں

☆

اچھوں کی صحبت
ذہن و دل کی بیداری
وسعت آفاقی

☆

اسنادی شخصیت
الف سے نابلد
کھوکھلی بنیادیں

☆

سنسان سڑکیں
سوگ میں ڈوبے منظر
لہولہان قومیں

☆

میں قلم
تو روشنائی
کاغذ نا آسودہ

☆

نابینا ہے سچ
بغض و کینہ دولت مند
جھوٹوں کا دربار

☆

شاخِ لذت
پھول پھل سے بامراد
اور جڑیں دیمک زدہ

☆

شیش محل
زہریلے بچھو
نیندوں کے محتاج

☆

زقوم کے پھول
ہاتھوں سے پھینک دو
سزائیں ہیں سنگین

☆

گاؤں کے بچے
آم کے پیڑ نالاں
سوکھے ہوئے تالاب

☆

کمرہ، تنہائی
بستر پہ خوشبو کا راج
رات بڑی بدمعاش

☆

ارادے مضبوط
حوصلے فلک آشنا
وقت مبہوت

☆

کاغذی رشتے
مٹتی ہوئی قدریں
قیامت کے آثار

☆

PDF Compressor Free Version

تبسم فاطمہ

104 D, Taj Enclave, Geeta Colony, Delhi 110031

کہیں دبائی جارہی ہے ایک چیخ.....

کہیں دبائی جارہی ہے ایک چیخ
گہرے سناٹے میں لکھی جارہی ہے ایک خوفناک کوتیا نظم
قبرستان سے شمشان گھاٹوں تک
جلتے ہوئے انسانی گوشت کی بدبو کے درمیان
دیکھا جاسکتا ہے، جمہوریت کے مردہ اور سڑے ہوئے جسم کو
جس پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں ہیں
سیاسی حکمرانوں کے خوفناک ٹھٹھے ہیں
ماچس کی تیلیوں میں موت بند ہے
خوفزدہ کیا جارہا ہے سیاست اور طاقت کے نام پر
کچھ مخصوص لوگوں، طبقوں یا کمزور شناخت چہروں کو
جو آزادی کے جشن سے لے کر اب تک
ہر بار اپنا چہرہ بھولتے ہوئے، حاشیے پر رہے ہیں

کہیں دبائی جارہی ہے ایک چیخ
نصاب کی کتابوں سے تاریخ بدلنے تک
کہیں بے دردی سے مارا جارہا ہے کسی روہت بمملا کو
کہیں کسی معصوم کنہیا کے سچ کو ظالم بوٹوں سے روندا جارہا ہے
انسانی گوشت کے فتووں پر ذبح کیا جارہا ہے عام لوگوں کو
راشٹر واد کے خونی کھیل میں
اپاہج اور نپنسک بنانے کی تیاری ہورہی ہے
انصاف کی عمارتوں تک پہنچ چکی ہے بھگوا بوٹو کی آہٹ
وہ بھیڑیوں کی طرح حملہ کررہے ہیں
سہمی ہوئی صدی کے مردہ جسم پر ٹوٹ پڑے ہیں
وہ لپلپاتی زبانوں سے چیل، کوؤں اور گدھوں کی طرح
وہ انسانی حقوق اور جمہوریت کی ہڈیاں چبا رہے ہیں
ہم اس مرتے ہوئے ملک کے گواہ ہیں
جہاں ہر سسکی اور خوف کے ہر ورق پر
نتھو رام گوڈسے کے نام کی تختیاں لگائی جارہی ہیں
بے نشان کیا جارہا ہے، عدم تشدد کے فلسفوں کو
یہاں گاندھی کا نام لینا جرم ہے
برہمن واد کی چھتری کے سائے میں
فاشزم کی نئی عبارت لکھنے کے لئے
اکٹھا کیا جارہا ہے بھوکے اور خوفناک بھیڑیوں کو
کہیں بنایا جارہا ہے ایک نیا ملک
کہیں دبائی جارہی ہے ایک چیخ

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

منوّر داناپوری

Shah Toli, Danapur Cantt. Patna (Mob. 8804905970)

نئی صدی کا چراغ

نئی سحر ، نئی دنیا ، نئی خوشی کا چراغ
ہے میرے ہاتھ میں روشن نئی صدی کا چراغ

اندھیری رات ہے طوفاں میں بڑھتے جانا ہے
ہر ایک راہ میں مشعل مجھے جانا ہے
ہے مجھ سے ضوفشاں اکیسویں صدی کا چراغ
ہے میرے ہاتھ میں روشن، نئی صدی کا چراغ

جو انقلاب زمانہ ہے ولولہ میرا
نئی صدی نے بڑھایا حوصلہ میرا
کہ میرے عزم سے تاباں ہے زندگی کا چراغ
ہے میرے ہاتھ میں روشن نئی صدی کا چراغ

یہ حق ہے شمع جلائی ہر ایک شعبے میں
کہ راہِ نو بھی بنائی ہر ایک شعبے میں
ہے مجھ سے آج بھی تابندہ رہبری کا چراغ
ہے میرے ہاتھ میں روشن نئی صدی کا چراغ

اسی سے دل بھی ملا ہے، ملا ہے جس سے ہاتھ
تمام عمر نبھایا اسی کا میں نے ساتھ
جہاں میں مجھ سے ہے تابندہ دوستی کا چراغ
ہے میرے ہاتھ میں روشن نئی صدی کا چراغ

ستارے ، چاند ، ثریا پہ مجھ کو جانا ہے
اندھیری شب میں چراغِ سحر جلانا ہے
ہے مجھ سے ضوفشاں سائنسی آگہی کا چراغ
ہے میرے ہاتھ میں روشن نئی صدی کا چراغ

ہر ایک لفظ کو فکر و نظر سے سینچا ہے
تمام شعر کو خونِ جگر سے سینچا ہے
ادب میں مجھ سے منوّر ہے شاعری کا چراغ
ہے میرے ہاتھ میں روشن نئی صدی کا چراغ

PDF Compressor Free Version

سلطان اختر

مولانا آزاد نگر، ایف۔سی۔آئی روڈ کے پچھم

پوسٹ، پھلواری شریف، پٹنہ 801505 (Mob. 9097450586)

غزلیں

عہد زریں کی مجھے یاد دلانے نکلے
دل کے تہہ خانے سے ماضی کے خزانے نکلے
دشت پر ہول میں ہنگامہ مچانے نکلے
اپنی وحشت کا ہم اندازہ لگانے نکلے
جن کے چہرے پہ نحوست کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ سیہ رو ، ہمیں آئینہ دکھانے نکلے
جابجا میری تباہی کی بھی تصویریں تھیں
اُن کے قصے میں کئی میرے فسانے نکلے
شرم کی ڈور نے آگے کبھی بڑھنے نہ دیا
جب بھی وہ رسم کی دیوار گرانے نکلے
جن کے گھر بار ہیں تقسیم کی لعنت کا شکار
میرے آنگن میں وہ دیوار اُٹھانے نکلے
کئی چہرے پہ شناسائی کی پرچھائیں تھی
اجنبی لوگوں میں کچھ دوست پرانے نکلے
بے تعلق سحر و شامِ خزاں سے گزرے
فصل گل آئی تو ہم خاک اُڑانے نکلے
وہ بھی کرنے لگے جب عشق تجارت کی طرح
ہم بھی سرمایۂ جاں اپنا گنوانے نکلے

❁❁❁

غم حسین سے سرشار کر دیا گیا ہے
مجھے سپردِ عزادار کر دیا گیا ہے
برائے تجربہ بیکار کر دیا گیا ہے
رئیس شہر کو نادار کر دیا گیا ہے
خموشیوں کی صدا لب پہ گونجتی ہی نہیں
کہ مجھ کو مائل گفتار کر دیا گیا ہے
کہیں بھی اب مرا دست طلب نہ پھیلے گا
ضرورتوں کو خبردار کر دیا گیا ہے
یہ کیسا روگ لگا ہے ہماری آنکھوں کو
یہ کس کے غم میں گرفتار کر دیا گیا ہے
بس ایک دھند سی آنکھوں میں تیرتی ہے مدام
طلسم خواب کو بیکار کر دیا گیا ہے
حصارِ موج میں الجھا رہا سفینہ مرا
ہر ایک کشتی کو اس پار کر دیا گیا ہے
دلوں میں بکھری ہے ہر سمت انتشار کی خاک
مگر سکون کا اظہار کر دیا گیا ہے
بہت حسیں تو نہیں منظر طلوعِ سحر
جو ہم کو خواب سے بیدار کر دیا گیا ہے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

ظفر اقبال ظفر

170, Kheldar Fatehpur 212601 (U.P.) (Mob.07752801208)

غزلیں

سائے کا میں نے جب سوال کیا
دھوپ نے مجھ کو یرغمال کیا

عمر انساں میں رہ کے میری کٹی
دشت میں رہ کے کیا کمال کیا

رنج سے جب ملی نجات نہیں
خود کو شائستہ ملال کیا

عشق میں دے دی اس نے جاں اپنی
کارنامہ یہ بے مثال کیا

حوصلہ وہ دیا خدا نے مجھے
غم کے صحرا کو پائمال کیا

ہٹ کے دنیا سے جی رہا ہوں میں
پھر بھی جینا مرا محال کیا

ساری دنیا کو بانٹ کر خوشیاں
اپنی خوشیوں کو لازوال کیا

پھیر لیں اس نے اپنی نظریں ظفر
میں نے جب اس سے عرضِ حال کیا

❁❁❁

خود کو دنیا سے آشنا کر کے
ہوگیا گم وہ راستہ کر کے

دیتا رہتا ہے خود کو وہ شہرت
اک نیا روز مشغلہ کر کے

ڈھونڈتا پھر رہا ہے اپنے کو
خود کو اپنے سے وہ جدا کر کے

سنگ باری کے خوف سے آزاد
خوش ہے اپنے کو آئینہ کر کے

چاند تاروں میں دل نہیں لگتا
آگیا ہوں اسے خفا کر کے

زخم پائے کھلی فضا میں جب
اب وہ بیٹھا ہے دائرہ کر کے

ایک سناٹا چھا گیا ہے ظفر
ہے وہ خاموش اب صدا کر کے

❁❁❁

حد میں رہ کر اڑانیں بھرتا ہوں
شاخِ تہذیب کا پرندہ ہوں

کٹ گیا ہوں اَنا سے میں اپنی
تیغ دشمن سے کب میں کٹتا ہوں

تم سے ممکن ہو تو مٹا ڈالو
سطح دریا پہ حمد لکھتا ہوں

زد میں پتھر کے نہ آجاؤں کہیں
میں اُڑانوں سے اپنی ڈرتا ہوں

آئینہ بن کے آئے گا اک دن
خود کو تصویر کر کے بیٹھا ہوں

پیاس دل کی نہیں بجھاتے یہ
آنسوؤں کو میں آب کہتا ہوں

پاؤں تو لپٹے ہیں زمیں سے ظفر
میں فلک کی اڑانیں بھرتا ہوں

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

علینا عترت

No. 192/266, Triplicane High Road, Flat No. 16, Second Floor

غزلیں

جنوں میں دامن دل گرچہ تار تار ہوا
مگر یہ جشن سر کوچہ بہار ہوا

ہر ایک سجدے میں دل کو ترا خیال آیا
یہ اک گناہ عبادت میں بار بار ہوا

سمیٹ لی ہیں محبت نے ساری پروازیں
دل و دماغ میں کیسا یہ انتشار ہوا

نہیں بجھائے ہواؤں نے پہلی بار چراغ
یہ سانحہ تو مرے ساتھ بار بار ہوا

کسی کے واسطے تصویر انتظار تھے ہم
وہ آگیا پہ کہاں ختم انتظار ہوا

اندھیری شب کے مقدر میں اک سویرا تھا
یہ راز مجھ پہ دمِ صبح آشکار ہوا

جو تجھ میں ڈوب کے دیکھا تو پا لیا خود کو
علینا یوں مرا پھر مجھ پہ اختیار ہوا

❁❁❁

بدن گلوں کے دھلے دھلے ہیں کلی کلی مسکرا رہی ہے
یہ سوندھی مٹی کی بھینی خوشبو حواس پر میرے چھا رہی ہے

ذرا سا چھیڑا جو پھول کو تو خزانے خوشبو کے کھل گئے ہیں
محبتوں کی ہوئی ہے بارش ، ہوا کی شوخی بتا رہی ہے

اک اُڑتے بادل کا ہاتھ تھامے وہ کون مجھ کو بلا رہا ہے
مرے تصور کی شوخ تتلی یہ کس کے سندیسے لا رہی ہے

شرارتیں بادلوں کی دیکھو بھگودئے وادیوں کے دامن
اڑا کے خود کو یہاں وہاں پر ہوا بھی آنچل سکھا رہی ہے

کل ایک بھنورے نے صحن گلشن میں نام کیا پوچھا اک کلی کا
اُڑادی خوشبو نے بات فوراً ، ہر اک کو قصہ سنا رہی ہے

بگڑتے موسم کی سازشوں سے پہاڑ سے گر پڑا جو سورج
تو شام گہری اُداسیوں سے لپٹ کے آنسو بہا رہی ہے

گھٹا کا گھونگٹ ذرا ہٹا کے جو چاند چپکے سے مسکرایا
فلک نے واری ہیں کہکشائیں ، زمین موتی لٹا رہی ہے

علینا شعروسخن کے اسباب دیکھ کر ذہن و دل مگن ہیں
تو کائنات غزل بھی اک مصرع زیر لب گنگنا رہی ہے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر ذکی طارق

564, Kela Road, Gaushala Phatak
Ghaziabad 201009 (U.P.) (Mob. 09818860029)

غزلیں

ستارے توڑ کے لانے کی ایک خواہش میں
تمام عمر کٹی میری آزمائش میں

دکان اپنی سجاؤں گا اپنے زخموں سے
بلا سے اپنا لہو صرف ہو نمائش میں

کلاہ جھکتی رہی تھی رکوع کی حد تک
مگر جناب نے چپ سادھ لی سفارش میں

جہاں پہ برف کا سیلاب روز آتا تھا
وہاں بھی راکھ ہوئے لوگ اپنی آتش میں

کوئی تو کاغذی چھتری ہی سر پہ رکھ دیتا
میں چل رہا ہوں مسلسل غموں کی بارش میں

مری انا نے ذکی مجھ کو روک رکھا ہے
لکھا کبھی نہ کوئی لفظ خود ستائش میں

❁❁❁

اندھیری رات میں یادوں کے جب جگنو نکلتے ہیں
تو پھر بے ساختہ آنکھوں سے بھی آنسو نکلتے ہیں

ہمیں بھی امتحاں لینا ہے اب اپنی محبت کا
چلے آؤ کہ جیسے دشت میں آہو نکلتے ہیں

یہاں حرص و ہوس کی بے لباسی عام ہے ہر سو
مگر گل ہیں کہ برساتے ہوئے خوشبو نکلتے ہیں

سیہ راتوں کی خاموشی الگ مکتب لگاتی ہے
کہ ان گونگی کتابوں سے کئی پہلو نکلتے ہیں

سیاست مضطرب ہو کر نئی کروٹ بدلتی ہے
محبان وطن جب ہو کے بے قابو نکلتے ہیں

فقیری گمرہی کی منزلوں سے دور رکھتی ہے
یہاں سے راستے توحید کے ہر سو نکلتے ہیں

ذکی قسمت کا اب کوئی ستارہ دکھ نہیں دیتا
کبھی منگل ، کبھی راہو ، کبھی کیتو نکلتے ہیں

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

شارق عدیل

P.o. Marehra, Distt Etah 207401 (U.P.) (Mob. 9368747886)

غزلیں

شکوک روح و بدن کے اگر حصار میں رہتے
نہ ہم سکون میں رہتے ، نہ وہ قرار میں رہتے

جو پاٹ دیتیں ہوائیں خلائے روح کے منظر
ضرورتوں کے سمندر نہ انتشار میں رہتے

سمٹ رہی تھیں زمینیں ہر دھمک سے مسلسل
مرے قدم بھی کہاں تک رہِ فرار میں رہتے

اگر جوان نہ ہوتی رگوں میں خون کی حدت
مرے خیال کے لشکر نہ انتشار میں رہتے

رہِ فراق سے گزرے تو یہ خیال بھی آیا
ہم اپنی شاخ پہ کھلتے ، تری بہار میں رہتے

ہمارے ساتھ بھٹکنا کوئی کمال ہے شارقؔ
سسکتے لمحوں کے منظر دیارِ یار میں رہتے

❁❁❁

اگرچہ دل تو ترے پنجہ ہوس میں ہے
مگر یہ کیا کہ مسرت نفس نفس میں ہے

مجھے اسیر شب غم بنانے والے دیکھ
کہ اک چراغِ فروزاں ترے قفس میں ہے

پلٹ رہی ہیں نگاہیں اُجاڑ منظر سے
گلوں کا کیف کہاں حسن خار وخس میں ہے

یہ دل گرفتہ شجر کیسے اب زباں کھولیں
کہ پتہ پتہ ہواؤں کی دسترس میں ہے

اٹھو کہ ، نیند کی غفلت سے کچھ نہیں ہونا
سنو کہ ، ایک مقدس صدا جرس میں ہے

تو میرے صبر کی طاقت کو مشتعل کر دے
اَنا کا زعم اگر میرے راکھشس میں ہے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر منصور خوشتر

Editor "Darbhanga Times" Purani Munsafi
Darbhanga 846004 (Mob. 9234772764)

غزلیں

ناز بیجا میں اٹھا سکتا نہیں
ریت ہی پر گھر بنا سکتا نہیں

بے رخی جیسی دکھائی آپ نے
چاہ کر بھی میں دکھا سکتا نہیں

میں نے مہندی والے تیرے ہاتھ سے
کتنا کیا پایا ، بھلا سکتا نہیں

دائرے میں ہوں گھرا تہذیب کے
اس کے باہر میں تو جا سکتا نہیں

اپنا معیارِ شرافت بھی ہے ایک
کچھ بھی ہو ، اس کو گنوا سکتا نہیں

اس روش پر ناز ہے خوشتر مجھے
میں کسی کا دل دُکھا سکتا نہیں

❁❁❁

آپ کو مجھ سے محبت بھی نہیں
اور ''نہیں'' کہنے کی جرأت بھی نہیں

جاتے ہیں محفل سے میری جایئے
روکنا کچھ میری فطرت بھی نہیں

منحصر جس پہ ہو میری زندگی
تونے کی ایسی محبت بھی نہیں

بے وفا کی ہمرہی سے فائدہ؟
اور اب چلنے کی ہمت بھی نہیں

جو کبھی دیوار پہ لٹکائی تھی
اب ترے کمرے کی زینت بھی نہیں

میں کسی کو چھوڑ دوں تیرے لئے
تجھ سے کچھ ایسی تو قربت بھی نہیں

خوشتر اس مہندی لگے ہاتھوں کی اب
جانے کیوں پہلی سی رنگت بھی نہیں

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

کتابوں کی دنیا

نام کتاب	:	رات کا منظرنامہ
مصنف	:	ابرار مجیب
ناشر	:	عرشیہ پبلی کیشنز
اشاعت	:	۲۰۱۵ء
صفحات	:	۱۴۸ قیمت : ۳۰۰ روپے
مبصر	:	صدف اقبال

ابرار مجیب بنیادی طور پہ ایک کامیاب ناقد ہیں، لیکن انہیں ادب کی تمام اصناف پہ دسترس حاصل ہے خواہ وہ تنقید ہو، شاعری ہو، ناول نگاری ہو یا افسانہ نویسی، یہ ہر فن پہ یکساں طور پہ قدرت رکھتے ہیں۔ ''رات کا منظرنامہ'' ابرار مجیب صاحب کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے ان کے اس افسانوی مجموعے سے اردو ادب کے معیار و وقار میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ پورے افسانوی مجموعے کا مطالعہ کرنے کے بعد ابرار مجیب کی تخلیقی صلاحیتوں اور افسانے پر ان کی فنی گرفت کا شدید احساس ہوتا ہے۔

ابرار مجیب اپنی ذات کے ساتھ دوسروں کے درد و کرب کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں فکری و فنی گہرائی و گیرائی نمایاں طور پہ محسوس ہوتی ہے۔ اس افسانوی مجموعے کے ذریعہ ابرار مجیب نے ایک نئے اسلوب اور ڈکشن کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی فکری و ادبی فہم کا ادراک ہوتا ہے۔ جہاں ان کے افسانوں میں سماج کی دردناک و کربناک تصویریں ہیں، تہذیب و اقدار کا بکھراؤ ہے اور عہد حاضر کا تناؤ ہے، وہیں گہرے طنز کا ایک تیز نشتر بھی اس میں محسوس ہوتا ہے۔ درد و کرب اور گھٹن کی کیفیت افسانوں میں بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں کو اپنے افسانے میں بڑی خوبی کے ساتھ برتا ہے۔ ابرار مجیب جو کچھ اپنے اردگرد دیکھتے ہیں اسے انھیں اپنے افسانوں میں برتنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، سماجی مسائل کو بہت موثر انداز میں پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی فنی لوازمات کا بھی پورا خیال رکھتے ہیں اس لئے ان کی کہانیوں میں ابتدا سے انجام تک دلچسپی برقرار رکھتی ہیں۔

وہ اپنی ذات کے ساتھ دوسروں کے درد و کرب کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں، جس کا منھ بولتا ثبوت ان کا افسانہ ''افواہ'' ہے، جس میں شخصی خوف کو اس مشاقی سے افسانے کے قالب میں ڈھالا گیا ہے جو دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور بالآخر قاری ایک گہری فکر میں ڈوب جاتا ہے۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا، پرکھا، محسوس کیا اسے اپنے تجربات کی پوری صداقت کے ساتھ اس افسانے میں منتقل کر دیا ہے۔

''جنگ بند'' جنگ کے ماحول میں عوام کی نفسیات پہ لکھا گیا ایک کامیاب افسانہ ہے۔ اس قسم کے افسانے لکھنا ایک مشکل کام ہے اس کے لئے زبان و بیان پہ گرفت مضبوط اور مشاہدہ گہرا ہونا لازمی ہے۔ اس افسانے میں زبان و بیان کا خوبصورت رنگ، گہرا تجربہ اور رچاؤ نظر آتا ہے۔ ابرار مجیب کے اسلوب نے اس موضوع کو ایک نئی زندگی بخشی ہے۔ یہ افسانہ نفسیاتی پہلو بھی رکھتا ہے اور ہمیں بہت کچھ سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ افسانے کا بیانیہ بین الاقوامی سیاست میں بلیک پروپگنڈہ کی اہمیت اور کردار واضح کرتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ پہلو بھی مضبوطی کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے کہ میڈیا کے ہزار ہا پروپگنڈے کے

PDF Compressor Free Version

باوجود بین الاقوامی حالات میں، عوام میں دلچسپی صرف ذاتی نوعیت کی ہوتی ہے کہ جوں ہی ان کی دلچسپی کے خلاف ہوا، ان کی دلچسپی ختم ہوگئی صحافت کو الیکٹرانک میڈیا نے تجارت کی ایک بڑی منڈی میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے، صحیح اور غلط کی پہچان مٹا دی گئی ہے، ضمیر کو مردہ بنا دیا گیا ہے۔ چینل والے اپنا بزنس اور ٹی آر پی ریٹنگ بڑھانے کے لئے کس حد تک گر جاتے ہیں۔ سماجی اخلاقیات کو وہ کس طرح دھول میں ملاتے ہیں اسے ''اسٹوری'' میں بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ ابرار مجیب کے نمائندہ افسانوں میں شامل ''اسٹوری'' گویا ایک آئینہ ہے جو میڈیا کے غلیظ چہرے کو دکھانے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ سنجیدہ موضوع پر لکھی گئی یہ ایک سچی اور بے باک تحریر ہے۔

''پشپ گرام کا اتہاس'' میں افسانہ نگار کا شعور متحرک اور بیدار نظر آتا ہے۔ یہ ایک مکمل علامتی افسانہ ہے۔ اس افسانے کا بیانیہ بہت طلسماتی، ماورائی اور بھید بھرا ہے اور ساتھ ہی ایک تسلسل اور روانی بھی ہے، ایک ایسی فسوں ساز فضا، جس میں انسان کھو کر رہ جائے۔ کہانی کے بہاؤ میں قاری بہتا چلا جاتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے:

''مہندر شرون دیکھتا ہے کہ وہ ایک سیاہ گھوڑے پر سوار کمل کنڈ کے کنارے آ کھڑا ہوا ہے۔ سندری نے نہاتے نہاتے اسے پلٹ کر دیکھا، اس کی آنکھوں میں عجیب چمک تھی، اس چمک سے اسے ڈر لگا، اس نے اپنی آنکھیں ہٹا لیں، مگر اسے محسوس ہوتا رہا کہ اس سندری کی چمکتی آنکھیں اس کے شریر پر دوڑ رہی ہیں۔ دوڑتے دوڑتے وہ آنکھیں اسے اپنے شریر کے خاص انگ پر ٹھہرتی محسوس ہوئیں۔ اسے اچانک لگا کہ شریر سے سارا لہو نچوڑا جا رہا ہو اور وہ پتھر کا بنتا جا رہا ہو۔ ودیارتھی جیون میں اسے پہلی بار ایسا تجربہ ہوا تھا۔ اس نے ہمت کر کے کنڈ کی طرف دیکھا تو وہ اب تک کھڑی اپنے نینوں سے اسے نچوڑ رہی تھی، پھر اس نے ایک ڈبکی لگائی اور جب ابھری تو مکمل کنڈ کا شفاف پانی دھیرے دھیرے سرخ ہونے لگا، جیسے کہیں سے اس میں لہو گھل رہا ہو۔ سندری کا ایک ہاتھ نیچے گیا اور جب باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بچے کا شریر تھا، ایک مردہ بچے کا شریر جس کی آنکھیں غائب تھی۔ مہندر شرون کی آنکھیں کھلیں تو وہ حیران و پریشان تھا۔ اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔''

زندگی کا تسلسل، فنا اور جبر ابرار مجیب کا محبوب ٹاپک رہا ہے۔ وقت کے قدموں کی چاپ اس افسانے میں واضح طور پہ سنائی دیتی ہے۔ یہ زندگی اور موت کی کہانی ہے جو ازل سے ابد تک جاری رہے گی۔ اس افسانے میں فنکار نے وقت کے چہرے کو اپنے انداز میں دیکھا ہے اور اسے بہت خوبصورتی کے ساتھ افسانے کے کینوس پہ پینٹ کیا ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے روشن ستارے کی مانند ہے جو قاری کا ہاتھ تھام کر کہکشاؤں کی نئی دنیا میں لے جاتا ہے۔ یہ افسانہ ایسا ہے کہ اسے جتنی بار پڑھا جائے ہر بار کوئی نہ کوئی نیا پہلو ذہن کے پردے پہ روشن ہوگا۔ یہ افسانہ مکاں، لامکاں، عروج و زوال کے گرداب میں الجھا ہوا ہے۔

''بارش'' افسانے میں بارش کو علامت کی نئی سطح پہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں بارش کو جبر کی ایک ایسی علامت کی شکل میں سامنے لایا گیا ہے جو حقیقت میں زندگی کی نوید سمجھی جاتی ہے:

''کہ بارش پابند ہے، ایک جبر کے تحت برستی ہے۔ میں حیران ہوں، پریشان ہوں، خوفزدہ ہوں..... اس روز بھی تو بارش ہوئی تھی جس روز مجھے کسی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لینا تھا، ہمیشہ کے لیے..... لیکن کتنی موسلا دھار بارش تھی وہ کہ باہر کی نالی کا گندہ پانی گھر کے کمروں میں داخل ہو گیا تھا۔''

اس افسانے میں زندگی کی گہری فلاسفی کو بیان کیا گیا ہے۔ انسانی زندگی کی بے ثباتی کا ذکر ہے۔ وہ زندگی جو مسلسل المیے اور حسن حیات کے بجائے حالات کے جبر کا شکار ہے، اسے بارش کا حسن متاثر نہیں کرتا بلکہ بارش میں وہ خود کو ایک ایسا بھیگا ہوا پرندہ محسوس کرتا ہے جو دعا گو ہے کہ یہ جبر کی بارش بند ہو جائے اور وہ اپنے پروں کو سکھا کر آسمان کی وسعت ناپ سکے۔

''پچھواڑے کا نالہ'' احساس رائیگانی کی کہانی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار چیخ چیخ کر اپنی بے بسی کا اظہار کر رہا ہے۔ بے بسی، بے یقینی اور

PDF Compressor Free Version

مایوسی کی نفسیات کو اس افسانے میں بہت مہارت کے ساتھ پر دیا گیا ہے۔ یہ ایک صاف شفاف رواں دواں بیانئے میں تحریر کردہ ایک عمدہ تخلیق ہے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''کچھ یہی ماحول چند روز پہلے اس گھر کا بھی تھا۔ بہت سارے لوگ آئے تھے۔ ہاں وہ سب بھی جو، ابا کی زندگی میں کبھی نہیں آئے۔ وہ رو نہیں رہے تھے۔ وہ چیخ نہیں رہے تھے۔ رو تو میں رہا تھا۔ آنسوؤں کی دھار تو نازیہ کے گالوں پر رواں تھی۔ چیخ چیخ کر تو اماں کا حلق زخمی ہو رہا تھا۔ ہاں ہم پرندے تھے۔ بے بس پرندے، اور وہ لوگ، وہ خاموش تھے، اداس نہیں۔ ان کی صورتیں ہر طرح کے جذبوں سے عاری تھیں، تو پھر..... تو پھر وہ کیوں آئے تھے۔ کیوں؟ کیوں؟؟ کیوں؟؟؟''

''پچھواڑے کا نالہ'' میں زندگی کا کھلی آنکھوں اور گہری بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ زندگی ایک ایسی مہم ہے جسے تا عمر سر کیا جائے تب بھی دامن خالی ہی رہتا ہے، ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ کہانی کا اصل جوہر پچھواڑے کا نالہ ہے۔ نالے کا تصور اس امر سے ہے کہ یہ اپنے ساتھ غلاظت اور تعفن بہالے جاتا ہے اور نالہ یہ کام مسلسل کرتا رہتا ہے۔ اگر اس میں کسی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہو جائے تو افراد خانہ اذیت محسوس کرتے ہیں۔ زندگی کی بھی یہی صورت ہے اگر اذیت ناک رنج وغم کے لمحات ٹھہر جائیں تو حیات تعفن زدہ ہو جاتی ہے۔ خوبصورت جملوں اور خوبصورت الفاظ سے مزین یہ افسانہ یقیناً اس مجموعے کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جائے گا۔

''پردھان منتری کی آمد'' سیاسی پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ اس افسانے کو وسیع تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ معاشی اور معاشرتی قوت حاصل کرنے کے بعد یہ سیاست داں کیا کرتے ہیں، کس طرح صرف الفاظ کے جوہر دکھا کر معصوم عوام کو بے وقوف بناتے ہیں، ہاد و کا کتا اس کہانی کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ سب سے اہم افسانے کا اختتام ہے جس پردھان منتری کے لئے شہر کو سجایا جاتا ہے، غریبوں کی جھگیوں اور فٹ پاتھ پہ بچی دکانوں کو اجاڑ دیا جاتا ہے، شہر کو نئے سرے سے سجایا جاتا ہے، اسی پردھان منتری کے جانے کے بعد بادو کا کتا اس کی تصویر پہ پیشاب کرتا ہے۔ یہ کتے کا پیشاب نہیں عوام کے دلوں میں جمی نفرت اور ان کا غصہ ہے جو کتے کے پیشاب کی شکل میں باہر آتا ہے۔ ابرار مجیب اپنے افسانوں کو منفرد موضوع اور اسلوب سے آفاقیت عطا کرتے ہیں۔ یہ فنکارانہ حسن ان کی انفرادیت ہے جو افسانہ کو لازوال بنا دیتا ہے۔

نام کتاب:	آسماں تہہ خاک		
مصنف :	احمد جاوید	اشاعت :	۲۰۱۵ء
صفحات :	۲۰۱	قیمت :	۱۳۰ روپے
مبصر :	خالد عبادی		

احمد جاوید سے میں بہت دنوں سے واقف ہوں۔ دہلی کی زندگی میں ''وہ نئی دنیا''، ''ہندستان ایکسپریس'' اور دیگر اخبارات سے گزرتے ہوئے ''انقلاب'' پٹنہ تک پہنچے ہیں۔ انہوں نے جاوید پنڈولوی اور غالباً جاوید فریدی کے نام سے بھی تھوڑا بہت لکھا ہے۔ ان کے لکھنے کے انداز میں اصل تبدیلی نام بدلنے یعنی احمد جاوید بننے کے بعد آئی ہے، حالانکہ احمد جاوید ایک ممتاز پاکستانی شاعر کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ وہ احمد جاوید سے سینئر ہیں۔ بہر حال ناموں میں کیا رکھا ہے، ہمارے یہاں تو بیک وقت دو دو شاہد اختر الگ الگ صنفوں میں ایک ہی نام سے سرگرم نظر آتے ہیں اور کسی کو قباحت نہیں ہوتی۔ ہندستان کی حد تک یہ نام کچھ نیا اور جاذب نظر معلوم ہوتا ہے۔ احمد جاوید سے تھوڑے بہت شخصی مراسم کے حوالے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ صاف ستھرے ذوق کے اعتدال پسند شخص ہیں۔ ان کے ملنے جلنے والوں میں ہر طبقہ اور فکر کے لوگ شامل ہیں، لہٰذا ان کی کتاب ''آسماں تہہ خاک'' بھی سبھی رنگ اور مزاج رکھنے والوں کے ذکر سے آراستہ ہے۔

''آسماں تہہ خاک'' میں مہر شکروی، مدن جیت سنگھ، ارشد القادری، غلام سرور، پروانہ ردولوی، شبنم کمالی، حفیظ بنارسی، عبد المغنی، ظفر احمد نظامی، انبساط احمد علوی، منصور عمر، اسید الحق، محمد عاصم قادری بدایونی جیسے بے نظیر اور یادگار زمانہ لوگوں پر اپنے تجربات اور تعلق خاطر یا

PDF Compressor Free Version

گاہ بگاہ کی ملاقاتوں کی روشنی میں احمد جاوید نے ان کے انفرادی اور انتہائی خوبصورت خدوخال واضح کیے ہیں اور کتاب کے پیش لفظ اور پس منظر کے تحت کئی صفحات پر محیط اپنے پرکھوں کی داستان ''قصہ باغ والوں کا'' کی صورت میں مزے لے لے کر بیان کیا ہے، تاکہ کتابوں یا تحریروں میں یہ قصہ زندہ رہے یا نہ رہے، یادوں میں یہ تواتر کے ساتھ زندہ رہے۔ دو صفحے کے پیش لفظ بعنوان ''بیتے موسموں کی بازیافت'' کے دوسرے پیرا میں وہ رقم طراز ہیں:

''مشاہیر زمانہ کے یہ خاکے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کا عمل اور تلاش ذات کی کاوش بھی ہے اور مایوسی کے اندھیرے اور بے بصیرتی کی چکاچوندھ میں اپنے گردو پیش کے حسن کو دیکھنے اور محسوس کرنے کی ایک اپنی سی کوشش بھی جس میں اب آپ بھی شریک ہیں اور یہی بات زیادہ لائق شکروسپاس ہے۔''

یہ شاید خاکوں کی کتاب ہے، یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یادنگاری ہو۔ اس کے نام کو دیکھئے اور یہ خیال فرمایئے کہ جن شخصیات کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے، ان میں سے سب فوت ہو چکے ہیں۔ ان شخصیات میں ہر رنگ اور طرز وادا کے لوگ ہیں۔ مہر شکروی فقیرانہ زندگی بسر کرنے والے تھے اور جلسوں میں اپنا کلام سنا کر ملنے والی رقم پر گزارہ کرنا اور خالی اوقات میں کسی پوکھر میں جا کر مچھلی مارنا ان کا شیوہ تھا۔ ان کی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے مزاج سے آشنا تھے۔ انہوں نے اپنے تجربات کو بھی شعری زبان عطا کی۔ ایک ایسی بستی میں جہاں شعروشاعری کی کسی کی فرصت نہ ہو اور لوگ اپنے اپنے مال واسباب میں اضافہ کرنے اور اپنی شان و شوکت کو بڑھانے میں لگے ہوں، مہر شکروی نے ایسے لوگوں کے درمیان

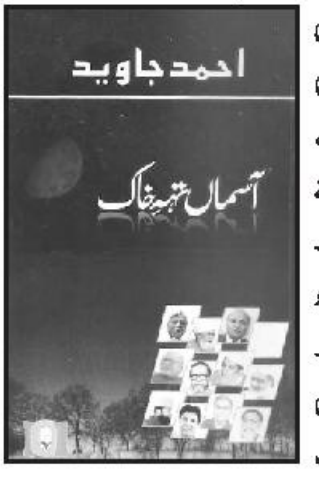

شاعری کی شمع کو زندہ رکھا۔ وہ اپنی زندگی سے مطمئن اور اللہ پر قانع تھے۔

مدن جیت سنگھ جیسی شخصیت جن سے ہم جیسے لوگ شاید ناواقف ہی رہتے اگر احمد جاوید نے ان پر ''ساشیا کی کہانی کا شہزادہ'' لکھ کر ان سے متعارف کرانے کا فریضہ بخوبی نہ نبھایا ہوتا۔ مضمون میں ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

''دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو خدمت خلق اور کار خیر کے لئے اپنی بڑی سے بڑی دولت وقف کر دیتے ہیں، لیکن ایسے لوگ کتنے ہیں جو ملکوں اور قوموں کو امن و آشتی پر ابھارنے، ان میں اتفاق واتحاد پیدا کرنے اور بین الاقوامی امن ورواداری کے نصب العین کو فروغ دینے کے لئے اپنی زندگی اور اپنے تمام تر وسائل وقف کر دیں۔''

پچھلے اقتباس کے فوراً بعد سے ایک اور اقتباس پیش کرنا چاہوں گا کہ مدن جیت کی قربانی اور کارنامے کا صحیح ادراک ہو سکے، ملاحظہ ہو:

''مدن جیت سنگھ نے عمر کی اس منزل میں جب کسی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان کی خواہش اچھی ملازمت کا حصول اور نئی امنگوں کی تکمیل ہوتی ہے، کیمیکل انجینئر کی حیثیت سے کیریئر شروع کرنے کی بجائے آرٹسٹ بن کر ہندستان کی رنگا رنگ تہذیب وثقافت کو محفوظ کرنے اور فرزندان وطن کو اصل ہندستان دکھانے کی مہم پر نکل پڑنے کا فیصلہ کر لیا، پھر زندگی بھر ملک و بیرون ملک ہندستان کی تہذیب وثقافت کے نقیب و سفیر کی حیثیت سے دن رات ایک کر دیئے اور عمر کے اس حصے میں جب لوگوں کی خواہش آرام کی ہوتی ہے، اپنے آئی ٹی انجینئر بیٹے جیت کی قائم کردہ سوفٹ ویئر کمپنی اے ٹی جی (آرٹ ٹکنالوجی گروپ) کے حصص بیچ کر کروڑوں ڈالر کی لاگت سے کے ساتھ 'ساؤتھ ایشیا فاؤنڈیشن' قائم کیا جو خطہ جنوبی ایشیا میں تہذیبی وثقافتی تنوع کے تحفظ، علاقائی تعاون اور سماجی و اقتصادی ہم آہنگی کے فروغ کے لئے یونیسکو اور سارک کے ساتھ

PDF Compressor Free Version

مل کر کام کرتا ہے۔''

اس طرح کے لوگوں پر لکھا گیا مضمون قلم کا حق ادا کرنا کہلائے گا۔

باقی لوگوں میں ارشد القادری، غلام سرور، پروانہ ردولوی، شبنم کمالی، حفیظ بنارسی، عبد المغنی، ظفر احمد نظامی اچھے خاصے ممتاز و معروف لوگ تھے۔ انبساط احمد علوی نے بھی صحافت میں اپنی پہچان بنائی۔ منصور عمر نے استاذ کے ساتھ شاعر اور نقاد کے طور پر بھی اپنی الگ پہچان بنائی۔ اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی پر لکھا گیا مضمون بھی مصنف کی غایت درجہ واقفیت اور اپنے ہم عصروں کی صلاحیتوں اور ان کے علم وفضل کا کھلے دل سے اعتراف نامہ ہے اور صاحب مذکور سے محبت وارادت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

اپنے اہل اور ذی علم ہم عصروں کی قدر کی روایت اب دم توڑ رہی ہے۔ احمد جاوید نے اس سنت کو آگے بڑھایا ہے۔ بعض بزرگوں کے ذکر میں بڑی دلچسپ اور کارآمد باتوں سے روبہ رو ہونے کا موقع ملتا ہے۔ غلام سرور پر لکھا گیا مضمون بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ ارشد القادری پر لکھا گیا مضمون ان کے اوصاف اور ان کے فضائل کو بڑی ایمانداری سے نہ صرف بیان کرتا ہے بلکہ ہمارے اندر ترغیب و تحریک بھی پیدا کرتا ہے۔ حضرت ارشد القادری کے بارے میں خاص طور سے ان کی تعلیمی جدوجہد اور اس میں ملنے والی کامیابی کا ذکر نہ صرف متاثر کرتا ہے بلکہ دل کو بھی اچھا لگتا ہے۔

ان شخصیات میں سے غلام سرور سے میری صرف شناسائی تھی۔ ارشد القادری، مدن جیت سنگھ، مہر شکروی سے کبھی ملا نہیں تھا، لیکن مہر شکروی کو زیادہ اور ارشد القادری کو تھوڑا بہت جانتا تھا۔ پروانہ ردولوی سے بھی کبھی ملاقات نہیں ہوئی لیکن صحافی کے طور پر ان کا ذکر آتا رہتا تھا۔ شبنم کمالی کی شخصیت انتہائی شفیق اور دلنواز تھی۔ شاعر کی حیثیت سے میں ان سے زیادہ متاثر نہیں تھا، یہاں تک کہ وہ نعتیں جن کے لئے انہیں جانا جاتا ہے وہ بھی میری نظر میں ایم اے شمسی دوگھروی کی نعتوں ہی کی طرح ہیں، لیکن ان کی شخصیت بڑی نفیس اور ملائمت رکھنے والی تھی۔ بعد میں جب خانقاہ سرقندیہ دربھنگہ کے مدرسے میں انہوں نے شیخ الحدیث کی ذمہ داری قبول کی، اس عرصے میں بھی ان سے میری ایک آدھ ملاقات ہوئی۔ میں انہیں شخصی طور پر پسند کرتا تھا، لیکن شعر و شاعری کی بے خودی اور سرشاری سے بھری راہ ان کے لئے نہ تھی۔ خواہ مخواہی ان کا دامن گرد آلود ہوا۔ وہ دینیات اور اسلامیات کے میدان میں کچھ کر سکتے تھے۔ ممکن ہے کچھ کام یادگار بھی چھوڑا ہو۔ انبساط احمد علوی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ انتہائی نیک اور شریف الطبع انسان تھے۔ منصور عمر نے تو مجھے گریجویشن میں پڑھایا ہی تھا۔ کتاب کے آخر میں ''عکس کتاب'' کے تحت مضامین کے عنوانات بالترتیب دیئے گئے ہیں۔ یہ عنوانات انتہائی دلچسپ، خوبصورت اور تخلیقی ہیں۔ مجھے ان پر رشک آتا ہے اور دوسروں کو حیرت۔ امید کہ یہ کتاب مقبول خاص وعام ہوگی۔

❁❁❁

مہمیز (ص ۵۲ سے آگے)

''بُوا .....!'' میں ابھی شش وپنج میں ہی تھا۔

''بُوا نہیں حامد میاں۔ یہ تیری بھابی ہے'' عرفان کا چہرہ پرجوش لگ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی دھمک رقصاں تھی۔

''بھابی.....!'' میں حیران وپریشان ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ دونوں بڑی شوخی کے ساتھ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں حیران تھا، یہ پینتالیس سالہ بُوا اور تیس سال کے نوجوان عرفان کو کس نے ایک بندھن میں باندھ دیا ہے۔ میرے دل میں بُوا کے خلاف بری بری باتیں آرہی تھیں۔

''ہونہہ! بوڑھی گھوڑی.....'' تبھی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ میرا دوست اس بڑے ہوٹل کا مالک اسی بُوا کی وجہ سے بن چکا تھا۔ مجھے تاشی کی وہ پہلی بات یاد آرہی تھی جو شاید عرفان نے بھی اپنی ذہن کی جیب میں گرہ باندھ کے رکھ لی تھی۔ ''گھر میں بُوا کی حکمرانی چلتی ہے، یہ جو کہے گی وہی بنے گا۔''

تبھی تو.....! اب مجھے بھی بُوا تاشی سے زیادہ جوان اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ ❁❁

PDF Compressor Free Version

ہماری سرگرمیاں

سرحد پار کے معروف شاعر اسلم راہی کی بہار اردو اکادمی میں تشریف آوری

پٹنہ: گزشتہ دنوں ۱۶ جون کو، اسلام آباد پاکستان سے تشریف لانے والے مہمان شاعر جناب اسلم راہی کے اعزاز میں، بہار اردو اکادمی میں بروقت ایک ''ادبی ملاقات'' کا اہتمام کیا گیا جس میں نامور مقامی شعرا وادبا نے حصہ لیا۔ اس موقع پر سکریٹری بہار اردو اکادمی نے مہمان شاعر کا مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ اکادمی کے لئے باعث فخر ہے کہ وہ سرحد پار کے ایک اہم فن کار کی تشریف آوری کا اعزاز پا رہی ہے۔

جناب نوری نے بتایا کہ جناب اسلم راہی کا اصل وطن سہسرام (بہار) ہے اور وہ معروف تنقید نگار اور ماہر جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن کے بھانجہ ہیں۔ موصوف نے اسلام آباد کے سی ڈی اے آفیسر کے عہدے سے سبکدوشی کے بعد اب اپنا پورا وقت خصوصیت کے ساتھ شاعری کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ جناب راہی کے دو شعری مجموعے ''زخم گلاب ہوئے'' اور ''ہوا کے رنگین پیرہن'' چھپ چکے ہیں اور ان کا نیا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

اس موقع پر جناب راہی کو اکادمی کے ذریعہ شال اوڑھا کر، عزت افزائی کی گئی اور انہیں اکادمی مطبوعات بھی تحفتاً پیش کی گئیں۔ جناب راہی نے اکادمی کی اس محفل کو اپنے لئے یادگار بتاتے ہوئے کہا کہ یہ اکادمی مطبوعات، میرے لئے یادگار ادبی نوادرات کی مانند ہیں۔ میں اسلام آباد میں رہتے ہوئے، بہار اور خصوصاً بہار اردو اکادمی کی سرگرمیوں سے تازہ واقفیت رکھنے کا ہمیشہ اہتمام کرتا ہوں۔ یہاں کی حالیہ ادبی وثقافتی کارگزاریاں بیشک حوصلہ افزا ہیں اور اس کے لئے بہار کی اردو آبادی اور خصوصاً سکریٹری اکادمی جناب مشتاق احمد نوری بیحد شکریہ کے مستحق ہیں۔ جناب راہی نے دوران گفتگو پاکستان کے ادبی ماحول کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ پاکستان میں اردو کو وہاں کی پنجابی، سندھی اور بلوچی جیسی مقامی زبانیں، پنپنے نہیں دے رہی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہاں مہاجرین کے حالات بھی اطمینان بخش نہیں ہیں۔

مذکورہ ''ادبی ملاقات'' میں نائب صدر اکادمی جناب سلطان اختر اور ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے علاوہ پروفیسر علیم اللہ حالی، جناب عالم خورشید، جناب خورشید اکبر، جناب ناشاد اورنگ آبادی، جناب شوکل احمد، جناب شمیم قاسمی، ڈاکٹر جاوید حیات، جناب جاوید محمود، محترمہ زرنگار یاسمین اور دیگر علمی و ادبی شخصیتوں نے حصہ لیا اور مہمان شاعر سے مختلف ادبی موضوعات پر دیر تک تبادلہ خیال کا سلسلہ جاری رہا۔ محترمہ زرنگار یاسمین نے اس موقع پر جناب اسلم راہی سے ایک خصوصی ادبی انٹرویو بھی لیا۔

جناب اسلم راہی کے ذریعہ اکادمی مجلّہ ''زبان وادب'' کی تازہ اشاعت کا اجرا بھی ہوا۔ واضح رہے کہ ''زبان وادب'' جون ۲۰۱۶ء کا یہ خصوصی شمارہ بابا سائیں پروفیسر شکیل الرحمٰن کی یاد میں ہے، جس میں ''مطالعہ شکیل''، ''خراج منظوم'' اور ''تبرکات شکیل'' کے تحت اہم علمی وتنقیدی نگارشات شامل ہیں۔ جناب راہی نے اس شمارے کی بروقت اشاعت کو ایک یادگار قدم بتایا اور کہا کہ اس کے لئے اکادمی یقیناً ستائشی کلمات کی مستحق ہے۔ تقریباً پانچ گھنٹے تک چلنے والی اس ادبی ملاقات کا اختتام سکریٹری اکادمی کے شکریہ کی تجویز پر ہوا۔

رضا اشک سمستی پوری کو اکادمی کی جانب سے خصوصی مالی اعانت

پٹنہ: گزشتہ دنوں ۷ رجون کو اکادمی سکریٹری جناب مشتاق احمد نوری نے، مقامی دانا پور کیشونر سنگ ہوم میں، معروف وبزرگ شاعر جناب رضا اشک سمستی پوری کی عیادت کی اور ان سے مختصر ملاقات کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بہار اردو اکادمی ایک اہم علمی وادبی اور

PDF Compressor Free Version

ثقافتی ادارہ ہے اور ایسے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کا اکادمی پر حق بنتا ہے جنہوں نے اپنی پوری زندگی شعروادب کی خدمت کے لئے وقف رکھی اور آج کبرسنی کے عالم میں بستر علالت پر ہیں۔ ہمیں فن کاروں کے ماضی اور حال کی متواتر خدمتوں کا ہمیشہ عملاً معترف رہنا چاہئے۔

جناب نوری نے بتایا کہ گزشتہ دنوں، ایک حادثے میں کولہے کی ہڈی ٹوٹ جانے کے بعد جناب اشکؔ، مذکورہ نرسنگ ہوم میں زیر علاج ہیں۔ ان کا آپریشن ہو چکا ہے اور ہفتہ دن کے اندر انہیں گھر جانے کی اجازت مل سکتی ہے۔ ایک سوال کے جواب میں سکریٹری موصوف نے کہا کہ جناب اشکؔ نہایت ضعیف العمر ہیں اور ظاہر ہے کہ لگ بھگ نوے سال کی عمر میں جب ہڈی ٹوٹ جائے تو مریض کی تکلیف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بہار اردو اکادمی کی جانب سے جناب رضا اشکؔ کو بیس ہزار روپے کی اعانتی رقم پیش کرتے ہوئے جناب نوری نے کہا کہ بیمار ادیبوں کا بیشک اکادمی پر حق بنتا ہے۔ جناب نوری نے پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک طویل عرصے کے بعد، نرسنگ ہوم میں جب میں ان سے ملا تو وہ مجھے بالکل ہڈی کا ڈھانچہ نظر آئے اور میں انہیں بیک نظر پہچان نہیں سکا، حالاں کہ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۰ء کے دوران جب میں سستی پور میں پوسٹیڈ تھا تو ان سے برابر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ان کے کئی شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ انہیں صاحب فراش دیکھ کر، ان کی شاعری میری نظروں میں گھومنے لگی اور ان کے دو اشعار مجھے برمحل یاد آ گئے۔

انگلیوں کی صلیب پر چڑھ کر　　مجھ سے مانگے ہے خوں بہا سگریٹ
زیست جلتی ہوئی سلائی ہے　　موت جیسے بجھا ہوا سگریٹ

ہماری دعا ہے کہ خدائے پاک جناب اشکؔ کو شفائے کاملہ سے نوازے اور انہیں مزید ادبی توانائی بخشے۔ آمین

''اوراق حیات'' کے اجرا کی تقریب میں مقتدر شخصیات کی شرکت

پٹنہ: گزشتہ دنوں ۱۱ر جون کو بہار اردو اکادمی میں شاہ عمران حسن کی کتاب ''اوراق حیات'' کے اجرا کی تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں اہم اور مقتدر شخصیات نے حصہ لیا۔ اس موقع پر سکریٹری اکادمی جناب مشتاق احمد نوری نے کہا کہ ہندوستانی علما میں مولانا وحید الدین خاں کا نام منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنے کام کرنے کا ایک رخ متعین کیا اور پھر پوری زندگی اسی نہج پر کام کرتے رہے۔ مولانا وحید الدین خاں پر اعتراضات بھی ہوئے، بہت سارے الزامات بھی لگائے گئے، مگر وہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے اور اپنی شخصیت کی انفرادیت کو محفوظ رکھا اور دینی نظریات کی تبلیغ و اشاعت میں وہ آج بھی ہمہ تن مصروف ہیں۔ شاہ عمران حسن نے اپنی کتاب ''اوراق حیات'' میں مولانا وحید الدین خاں کی زندگی کو خود ان کے اپنے الفاظ میں بہت خوبصورتی سے ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے، جو اس وقت دنیا میں مولانا وحید الدین خاں کی حیات و خدمات کو جاننے کا واحد ذریعہ ہے۔ یہ اہم ترین کام کرنے پر میں شاہ عمران حسن کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ''اوراق حیات'' کے اجرا کے موقع پر صفدر امام قادری، خورشید اکبر اور قاسم خورشید، انوار محمد عظیم آبادی، معروف عالم، ابرار عالم اور حافظ محمد تمنا وغیرہ نے شرکت کی۔

جناب خورشید اکبر نے کہا کہ مولانا وحید الدین خاں ایک متوازن شخصیت کے حامل ہیں اور انہوں نے دین کو متوازن انداز میں پیش کیا ہے، اگر کوئی اسلام کو سمجھنا چاہتا ہے تو مولانا وحید الدین خاں کی تحریریں اس کے لیے معاون ثابت ہوں گی۔ جناب صفدر امام قادری نے شاہ عمران حسن کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ آپ نے بہت اہم کام انجام دیا ہے۔ مولانا وحید الدین خاں کی گوناگوں شخصیت کو جاننے اور سمجھنے میں یہ کتاب بہت اہم رول ادا کرے گی۔ جناب قاسم خورشید نے اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کے نوجوانوں کو اس قسم کا تخلیقی، تعمیری کام کرتے رہنا چاہیے۔ اپنے

PDF Compressor Free Version

رہنما اور صاحب علم کی باتوں کو عام لوگوں کے سامنے لانے کی سعی بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔اس کی ایک زندہ مثال شاہ عمران حسن کی مولانا وحید الدین خاں پر لکھی گئی یہ ضخیم کتاب ''اوراق حیات'' ہے۔

''اوراق حیات'' کے اجرا کے موقع پر کتاب کے مرتب شاہ عمران حسن نے کہا کہ مولانا وحید الدین خاں کی شخصیت اور افکار وخیالات کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے میں نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا کا کام کئی دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے اور ان پر اب تک کوئی تحریری کام نہیں ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری یہ سعی مولانا کو جاننے اور سمجھنے میں ایک اہم اور سنجیدہ رول ادا کرے گی اور یہ نقش اول انشاءاللہ نقش ثانی کی تیاری میں معاون ثابت ہوگا، یہ کتاب اگرچہ مولانا کی سوانح عمری ہے، مگر اس میں آپ بیتی کا انداز غالب ہے جو یقیناً اس کے اثر ونفوذ میں اضافے کا باعث بنے گا۔شاہ عمران نے مزید کہا کہ اس کتاب کی تیاری میں تقریباً دس سال لگے، تب جا کر یہ کتاب آپ کے ہاتھوں تک پہنچی ہے۔انہوں نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ خاص طور پر اردو اکادمی کے سکریٹری جناب مشتاق احمد نوری کے ممنون ہیں کہ انہوں نے بہت کم وقت میں اس کتاب کے اجرا میں انہیں تعاون دیا۔واضح رہے کہ اس سے قبل جناب شاہ عمران حسن کی کتاب ''حیات رحمانی'' بھی سنجیدہ علمی وفکری حلقوں میں کافی مقبولیت پا چکی ہے۔

شاعری میں مہارت کی شرط

شاعری کیا ہے اور شاعرانہ تجربوں کو کس ڈھنگ سے پیش کرنا چاہئے یہ باتیں ہمیں اس طرح سیکھنی ہیں کہ ہم اس فن کے ماہر بن جائیں۔ مہارت پیدا کرنے کے لئے دو باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔اول تو یہ کہ دنیا میں جو بلند ترین معیار فن ہے اس سے پوری آگاہی حاصل کریں اور اعلیٰ نمونوں سے سبق سیکھتے ہوئے ریاض فن جاری رکھیں۔شاعری بچوں کا کھیل نہیں، یہ اناٹری اور عطائی کا کام بھی نہیں۔اس فن میں لطیف و رفیع ذوق اور بڑی ہنرمندی کی ضرورت ہے۔شاعر کے مزاج اور نظر میں وسعت وآفاقیت کے بغیر اعلیٰ شاعری وجود میں نہیں آسکتی۔شاعری کے معیار کی راہ میں مکانی یا زمانی تنگ نظری ٹھوکریں کھلاتی ہے۔جدید اردو شاعری کو صرف میرؔ و مرزاؔ، حالیؔ و اکبرؔ، اقبالؔ و جوشؔ سے ہی سبق لینا نہیں بلکہ اسے تلسی وسورؔ، سعدیؔ و فردوسیؔ، نابغہ و ابونواس، شیکسپیئر، ملٹن، ایلیٹ اور ریلکے سے بھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔سیکھ کر جذب کرنا، سیکھی ہوئی بات کو ذہنی طور پر ہضم کرنا اور پھر ان اسباق کو تخلیقی جدت وتازگی کے ساتھ منفرد رنگ میں استعمال کرنا حیات وترقی کی دلیل ہے۔شاعری ایک فن ہے، صناعی ہے۔ذوق فطری اور کاوش ومحنت کے بل بوتے پر ہی عمارت شاعری کھڑی ہوسکتی ہے اور اس میں حسن واثر پیدا ہوسکتا ہے۔اردو شاعروں کی نئی پود میں محنت وریاضت کی بڑی کمی ہے۔وہ دنیا کے اعلیٰ ترین شاعری کے نمونوں سے سیکھنے کو اپنے وہبی ملکہ شاعری کی توہین سمجھتے ہیں۔عجیب بات ہے کہ موسیقی، مصوری، صنم سازی وغیرہ فنون کی ہنرمندانہ مہارت کے لئے برسوں برس کی ریاضت ضروری سمجھی جائے، مگر فن شاعری میں حسن پرستی کی اجازت ہر بوالہوس سہل انگار کو دے دی جاتی ہے۔شاعری عاشقی ہے اور اس راہ میں وفاداری اور استواری شرط اول قدم ہے۔(اختر اورینوی کے مقالہ مشمولہ ''معاصر'' ج ۲ ح ۷ ص ۳۴ و ص ۳۵ سے ماخوذ)

PDF Compressor Free Version

سلام و پیام

☆ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ ماہ جون ۲۰۱۶ء بدست ہوا۔ ایک طرف سرورق کا حسن اور اس کی معنویت دامن دل کھینچ رہی ہے تو دوسری طرف اس یک موضوعی شمارے کے مشمولات بھی ہر لحاظ سے اپنی دستاویزی اہمیت کا احساس دلا رہے ہیں۔ یہ شمارہ ''مطالعہ شکیل'' کے لئے وقف ہے اور یقینی طور پر اسے اکادمی کی مجلاتی صحافت کا ایک بروقت اور کامیاب قدم کیا جائے گا، کیونکہ دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ مخلصانہ اور ذمہ دارانہ علمی وادبی مجلاتی صحافت کا یہ وظیفہ ہوتا ہے کہ وہ حسب حالات ان فن کاروں کی زندگی اور کارنامے سے نئی نسلوں کو روشناس کراتی رہے جو اپنے تمام تر علم و فضل کے باوجود اپنی خودداری کے گناہ بے گناہی کی سزا، کما حقہ قدردانی سے محرومی کی صورت میں پاتے رہے۔ زیر نظر شمارے میں ''ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے'' محض رسمی اداریہ نہیں بلکہ ایک جامع ادارتی مقالہ کا درجہ رکھتا ہے جس میں آپ کے قلم سے بہت ساری یادیں بھی صفحہ قرطاس پر بکھیر دی گئی ہیں اور بہت سارے قابل غور برجستہ نکات کی طرف بھی اشارے کر دئے گئے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ بابا سائیں علم وادب کے درویش تھے اور کسی بھی بڑے سے بڑے ایوارڈ کے مستحق، لیکن کسی کی بھی خصیہ برداری سے معذور تھے جب کہ آج کل انعام واکرام کے لئے یہ صفت لازمی ٹھہرتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ بہار اردو اکادمی نے ماہر جمالیات ڈاکٹر شکیل الرحمٰن پر، بروقت یہ شمارہ شائع کر کے ایک اہم ادبی فریضہ انجام دیا ہے۔ شمارہ ہر لحاظ سے وقیع اور معلوماتی ہے اور کیوں نہ ہو کہ یہاں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی زندگی اور کارنامے کا مطالعہ، متعدد قلم کاروں کے ذریعہ اس انداز سے یکجا ہو گیا ہے کہ پروفیسر موصوف کی ادبی جمالیاتی فکر ونظر کے تقریباً سبھی اہم تنقیدی وتجزیاتی گوشے، پڑھنے والوں کے سامنے آئینہ ہو جاتے ہیں۔ بیشک میر شناسی، تصوف کی جمالیات، اقبال کی شاعری اور ازیں قبیل دیگر موضوعات پر ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اپنی جو علمی باقیات چھوڑ کر، ہماری بزم سے اٹھے ہیں، اس کی تابانی تادیر قائم رہے گی۔ اس میں کیا شک کہ وہ ''نئے عہد کے منصور'' اور ''نقیب جمالیات'' تھے، وہ اگرچہ اب ہمارے درمیان نہیں، مگر ان کی وہ ''صدائے آشرم'' آج بھی گونج رہی ہے جسے آپ نے ''خراج منظوم'' کی صورت میں ہم تک پہونچا دیا ہے۔ ''تمکات شکیل'' میں 'احمد ندیم قاسمی کی تخلیق: بین' پر ''فکشن یا ترا'' کے تحت لکھا گیا تجزیاتی مضمون بہت ہی خاص تبرک کا درجہ رکھتا ہے۔ اکادمی سرگرمیوں کی تصویریں اور تفصیلی خبریں اس کی روز افزوں فعالیت پر گواہ ہیں۔ ''بچوں کا زبان و ادب'' بھی ہر لحاظ سے کامیاب، دلچسپ اور مفید و بامعنی مشمولات کا حامل ہے۔ خدا کرے یہ رونق علم وقلم سا دیر بڑھتی رہے۔

(ڈاکٹر) شائستہ انجم نوری
صدر شعبہ اردو، ٹی پی ایس کالج، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' مئی ۲۰۱۶ء کا مطالعہ چل ہی رہا تھا کہ آج، جون ۲۰۱۶ء کا شمارہ بھی موصول ہوا۔ میگزین کو ہر لحاظ سے بلندی کی طرف لے جانے میں آپ، یقینی طور پر بڑی محنت اور توجہ سے کام لے رہے ہیں۔ جب بھی نیا شمارہ سامنے آتا ہے، اپنی کچھ خاص ندرت کا احساس دلا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، مئی کے شمارے میں آپ نے ''منظومات'' کا حصہ حمد ونعت اور نظموں کے ساتھ، پانچ شعرائے کرام کی رباعیوں سے سجا دیا ہے اور اس طرح مجموعی طور پر اڑتیس رباعیوں سے، ہم پڑھنے والوں کی ضیافت کا سامان ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان رباعیوں میں موضوع کا تنوع بھی ہے اور فن کی بہترین پاسداری بھی۔ ظفر کمالی کی خمریہ رباعیوں کا اپنا تیور ہے تو قمر رئیس کی رباعیاں، نصائح، حقیقت بیانی، برجستہ طنز اور عصری حسیت کے اوصاف سے بالکل سجی سجائی دکھائی دیتی ہیں۔ محسن باعشن حسرتؔ کی رباعیوں میں جذبات محبت کی عکاسی ہے تو مامون ایمن کی رباعیاں ''ہستی'' کی ردیف کے ساتھ مشاہدے وتجربے اور فکر وفن کی خاص بہاریں دکھا رہی ہیں۔ اعجاز

PDF Compressor Free Version

مانپوری اور سمیع احمد صدیقی کے یہاں، وطنیت اور فلسفہ اور پند و موعظت کا رنگ ہے تو اصغر ویلوری اور اشرف یعقوبی کے یہاں بھی محبت کی پکار اپنا اثر دکھاتی ہے۔ نظموں کی بات کریں تو سلیم شہزاد کی نظم عمدہ ہی نہیں بہت عمدہ ہے۔ شمارے کے مضامین اور افسانے بھی نہایت پسندیدہ ہیں۔ جہاں تک ماہ جون کے میگزین کی بات ہے، اگرچہ ابھی ابتدائی انداز سے اس کی ورق گردانی ہی کر سکا ہوں، مگر مجھے یہ لکھنے میں کوئی عار نہیں کہ اسے آپ نے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی یاد میں ایک خاص اشاعت کی شکل دے کر بڑا کام کیا ہے۔ آپ کی ادارتی تحریر 'ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے' پورے صحافتی شعور کے ساتھ موضوع کے ایک نہیں انیک پہلو کو سمیٹے ہوئے ہے۔ آپ نے اس میں پروفیسر مرحوم کی شخصیت کے اہم رخ ہی نہیں دکھائے ہیں بلکہ عصری بے حسی اور ادبی دنیا کے خوشامد پسندانہ مزاج کی طرف بھی جس خوبصورتی اور جس خلوص سے اشارے کر دیے ہیں، وہ حساس ذہنوں کو تڑپانے کے لئے کافی ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ "زبان و ادب" ہمیشہ اسی طرح آگے کی منزلیں طے کرتا رہے۔

(ڈاکٹر) ثاقب انور، ہزاری باغ

☆ "زبان و ادب" جون ۲۰۱۶ء نظر نواز ہوا اور "اداریہ" کے ذریعہ عبقری ادبی شخصیت پروفیسر شکیل الرحمٰن کے حوالے سے آپ کی وابستہ یادیں تفصیلی طور پر پڑھنے کا موقع ملا۔ بیشک اس شمارے کو، پروفیسر شکیل الرحمٰن کے نام وقف کرنے کی کوشش میں آپ بہت حد تک کامیاب ہیں۔ اس شمارے میں مختلف مضامین کے ذریعہ شکیل الرحمٰن کے تعلق سے جس قسم کی جانکاری فراہم کی گئی ہے اس سے یقیناً صرف باذوق قارئین ہی نہیں بلکہ طلبا و طالبات بھی خوب خوب مستفیض ہوں گے۔ بیشک "مطالعہ شکیل" کے سارے مشمولات پر مغز ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات افزا بھی ہیں اور "خراج منظوم" کے شعرا بھی پوری طرح کامیاب ہیں۔ "تبرکات شکیل" کا انتخاب مختصر سہی، مگر بہت عمدہ اور پر اثر ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن کے قلم سے "جمالیات" کا علمی تجزیہ اور پھر ان کی "فکشن یاترا" کے تحت "لمبے قد کا بونا" اور "بین" کا تجزیاتی مطالعہ خاصے کی چیزیں ہیں۔ "بچوں کا زبان و ادب" بھی ماشاءاللہ دینی اور دنیاوی دونوں ہی نظریے سے معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ کافی دلچسپ ہے۔ ڈاکٹر ابو منور گیلانی کی تحریر "حضرت علی کی معاملہ فہمی" اور جناب عبدالودود انصاری کا مضمون "قرآن اور سائنس" بہت پسند آیا۔ "کتاب میلے کا افادی پہلو" میں جناب شرف الہدیٰ نے بہت اچھے نکات، بہت ہی اچھے انداز سے پیش کیے ہیں۔ ایک طرف موسم اور موقع کے لحاظ سے "گرمی"، "ماہ صیام" اور "آم" جیسی دلچسپ نظمیں ہیں تو دوسری طرف ڈاکٹر شارقہ شفتین کی کہانی "کرکٹ" جو یقیناً بچوں کے لئے کامیاب تنبیہی کہانی کہلا سکتی ہے۔ سچ بھی ہے کہ بچوں کے میلان اور ان میں کھیل کود کے شوق کی بھی ہمت افزائی ضروری ہے اور اس سلسلے میں ان کی ذہنی تربیت بھی، ڈاکٹر شارقہ نے یہ دونوں پہلو سامنے لا دیا ہے۔

نشاط اختر، پٹنہ

☆ "زبان و ادب" کے دو حالیہ شمارے ایک ساتھ ملے۔ اس بات میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ رسالہ اپنی پہچان بنانے اور بنائے رکھنے میں ہر اعتبار سے کامیاب ہے۔ مئی ۲۰۱۶ء کے شمارے میں سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری پر جناب متھن کمار کا مضمون اور فیض کی مزاحمتی نفسیات پر ڈاکٹر فصیح الدین احمد کا تجزیاتی مقالہ بہت کامیاب ہے۔ کہانیوں کے حصے بھی خوب ہیں۔ لطف و لذت کا حصول اصل میں ایک نفسیاتی معاملہ ہے اور جب ماحول بدلتا ہے تو مزاج ایک طرح کی اجنبیت کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ مطلوبہ یا متوقع لذت میں کمی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس نفسیاتی نکتہ کو ایم۔ مبین نے اپنی کہانی "لذت" میں بہت سلیقے سے پیش کیا ہے، بس یہ کہ بیانیہ میں کہیں کہیں تھوڑی سی طوالت آ گئی ہے۔ محمد ہاشم خاں اور ہما فلک بھی اپنی نفسیاتی کہانیوں کی بنت میں کامیاب ہیں۔ مطالعہ کے دوران شروع میں بلکہ کچھ دیر تک تو ایسا ہی لگتا ہے کہ یہ کہانیاں احساسات کو ہولے ہولے چھو رہی ہیں، مگر اختتام تک پہونچتے، کہیں نہ کہیں کسی دکھتی رگ پر قلم کار کی انگلی پڑ ہی جاتی ہے

PDF Compressor Free Version

اور قاری کا نفسیاتی سراپا جھنجھنا اٹھتا ہے، صدر عالم گوہر کی کتاب ''چاندنی خیالوں کی'' پر ڈاکٹر حسن رضا کا تبصرہ بہت متوازن ہے اور اس میں نمونے کے لئے اشعار بڑے احتیاط سے چنے گئے ہیں۔ کل ہند اردو صحافتی سمینار کے ساتھ ہونے والے مشاعرے کے منتخب اشعار کا مطالعہ لطف دے گیا۔ اردو صحافت کی سمت ورفتار پر تازہ خیالات کو سمجھنے کے لئے بھی یہ اکادمی رپورٹ کافی مددگار ہے۔ جون ۲۰۱۶ء کا شمارہ آپ نے بابا سائیں کی یادوں اور باتوں کے لئے خاص کردیا ہے، جسے میں رسالہ کی شاندار صحافتی جست کا نام دوں گا۔ اظہار خضر، شیخ عقیل احمد، ڈاکٹر مشتاق احمد، اسلم بدر اور کہکشاں تبسم کے مضامین بہت ہی بلند پایہ ہیں۔ ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کا سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے، اس کی تازہ خبر پڑھ کر خوشی ہوئی اور اس بات سے بھی مسرت ہوئی کہ اکادمی کے اشتراک سے مختلف اضلاع میں مسلسل ادبی سمینار کی محفلیں سج رہی ہیں۔ رمضان اور عید کی مبارکبادیوں کے ساتھ خدا حافظ

ایم نظیر حسن، سمستی پور

☆ ''زبان و ادب'' مئی ۲۰۱۶ء ملا۔ ''حرف آغاز'' حسب روایت شاندار ہے اور اردو والوں کو بروقت اپنا احتساب کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ''مقالات'' کے حصے میں جناب غضنفر نے بھی ''اردو کی عصری صورت حال'' کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے، اس حصے کے دوسرے مضامین بھی کامیاب ہیں۔ شعرے میں شامل سبھی افسانے پسند آئے۔ ''قصہ ایک راجہ کے وزیر ہوجانے کا'' نہایت شگفتہ انشائیہ ہے جس کے لئے پروفیسر اعجاز علی ارشد ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔ شعری حصہ اور کتابوں پر تبصرے کا حصہ بھی بہت خوب ہے۔ غزلوں کی اشاعت تو ظاہر ہے، ہوتی ہی رہتی ہے، لیکن آئندہ بھی اسی طرح گاہے گاہے مختلف شعرا کی رباعیات اور قطعات کو بھی ایک ساتھ خصوصی جگہ ملتی رہے تو بہت خوب ہو۔ ڈاکٹر نزہت پروین نے احمد صغیر کی کتاب پر اور ڈاکٹر حسن رضا نے صدر عالم گوہر کی کتاب پر محنت کے ساتھ تبصرے کا حق ادا کردیا ہے۔ ''بچوں کا زبان و ادب'' بھی مجموعی لحاظ سے بہت ہی اچھا دلچسپ اور قابل دید وقابل مطالعہ ہے۔

محمد پرویز اختر، مظفر پور

☆ ''زبان وادب'' پابندی سے مل رہا ہے۔ ہم بچوں کے لئے اس کا خاص تختہ تھوڑا سا ہوتا ہے، مگر یہ بہت مزیدار ہوتا ہے۔ مئی کے پرچے میں ڈاکٹر شائستہ انجم نے ''کبوتر'' کے بارے میں ڈھیر ساری باتیں بتائیں۔ اسی پرچے میں ریحانہ خاتون صاحبہ کی کہانی ''جاؤ اور آؤ'' بھی پڑھنے کو ملی جو بہت اچھی لگی۔ اس میں سچ مچ ایک بڑا سبق ہے۔ جون کے مہینے کا تازہ پرچہ بھی بہت پیارا ہے۔ جناب شرف الہدیٰ نے کتابی میلے کے فائدے بڑی آسان زبان میں اور ہلکے پھلکے انداز میں بتادیا ہے۔ ڈاکٹر شارقہ صاحبہ کی کہانی ''کرکٹ'' بہت اچھی کہانی ہے۔ اس کہانی سے کھیل کا شوق رکھنے والوں کو احتیاط کا سبق ملتا ہے۔ پرچے میں فیلر سے بھی بڑا فائدہ ہے۔ میں تو ہر مہینے کے پرچے سے فیلر کے جملے (اقوال) اپنی کاپی پر نوٹ کرلیتی ہوں، ایک اچھی سی نوٹ بک تیار ہوتی جارہی ہے۔ عید کے زمانے میں آنے والے پرچے کا انتظار رہے گا۔ خدا حافظ

عترت فاطمہ، بہار شریف

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کردیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔ اگر رجسٹرڈ پوسٹ سے رسالہ منگانا چاہتے ہوں تو اس کے لئے زر سالانہ ۳۵۰ روپے ہوگا۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔ اگر اگلے سال کا زر سالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے۔ (سرکولیشن انچارج)

PDF Compressor Free Version

بچوں کا
زبان وادب

☆	گوریارانی	ظفر کمالی	۷۴
☆	عید آئی	مہدی پرتا بگڈھی	۷۵
☆	گڑیا	اظہر نیر	۷۶
☆	تتلی، پھول اور بوندیں	احد پرکاش	۷۷
☆	فرض شناسی	انتخاب بن تنویر	۷۸
☆	عید	فاطمہ جبیں	۷۹
☆	اپنی مدد آپ	راحت جبیں	۸۰

PDF Compressor Free Version

ظفر کمالی

Ismail Shaheed (M.M.Colony) Mill Road, Siwan 841226

گوریا رانی

روٹھو مت گوریا رانی کھالو دانہ ، پی لو پانی
ننھا سا دل توڑ کے میرا مت جاؤ گھر چھوڑ کے میرا
کر لو مجھ سے تم یارانہ اترو آنگن میں روزانہ
چہکاروں سے من بہلاؤ چیں چیں ، چیں چیں گیت سناؤ
پھر سے بناؤ تنکے کا گھر اس میں انڈے دو تم آکر
وہ کھلیان تمہارا ہی ہے روشن دان تمہارا ہی ہے
بیٹھی کیوں ہو ، پر پھیلاؤ کھڑکی سے کمرے میں آؤ
کودو ، پھاندو ، دوڑو ، کھیلو چابی والا بندر لے لو
آئینے میں صورت دیکھو اپنی زندہ مورت دیکھو
رونق ہو تم میرے دَر کی زینت ہو تم میرے گھر کی
دل کو میرے شاد کرو تم چھت میری آباد کرو تم
گھر کیا میرے جی سے جڑنا میں سیکھوں گا تم سے اُڑنا

دنیا بولے جے گوریا
اے گوریا ، اے گوریا

PDF Compressor Free Version

مہدی پرتا بگڈھی

28- School Ward, Pratabgarh 230001 (U.P.) (Mob. 09005003950)

عید آئی

آگئی عید کہ پیغامِ مسرت آیا
ساری دنیا پہ عجب کیف کا عالم چھایا

کھل اٹھے چہرے تو گلزار ہوئی ہے دنیا
چاند کو دیکھ کے سرشار ہوئی ہے دنیا

روزہ داروں کی خوشی کا ہے نرالا عالم
ان کی محنت کا صلہ ملنے کا آیا موسم

سجدۂ شکر ادا کرنے چلے پیر و جواں
ہوں وہ معذور کہ بچے، سوئے مسجد ہیں رواں

سب امیر اور غریب آتے ہیں مسجد میں نظر
کتنا پرکیف نظر آتا ہے سارا منظر

ہاتھ اٹھائے ہوئے ہر شخص دعا مانگتا ہے
نورِ اخلاص کا چہروں پہ سماں جاگتا ہے

اے خدا کردے عطا امن و سکون و راحت
گھری آفات و بلا میں ہے نبی کی امت

ایک اک فرد کو اخلاق کی دولت سے نواز
سر سے ادبار ہٹا، امن کا کر دے دَر باز

دور ہر قلب سے ہو جائے کدورت کا غبار
اور ہر ذہن میں ہو قوم کی عظمت بیدار

عید کے صدقے میں دے دے ہمیں حسن کردار
بھول بیٹھا ہے بشر تو رواداری کا شعار

عید کی خوشیوں میں غربا کو بھی شامل کر لیں
ان کے دامن کو بھی نعمت سے خدا کی بھر دیں

خدمت خلق

''اپنے کام تو ہر آدمی کرتا ہے، لیکن اچھے آدمی دوسروں کے بھی کام آتے ہیں۔ ایسے آدمی زیادہ خوش رہتے ہیں اور خوش رہنے والے آدمی کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور وہ کام بھی زیادہ کرتا ہے۔ دوسرے کا کام کر کے جو اطمینان، جو سکون اور جو خوشی ہوتی ہے اس کا پورا اندازہ صرف اسی آدمی کو ہوتا ہے۔ جو دوسروں کے کام آتا ہے۔ دوسروں کے کام آنے ہی کو خدمت خلق کہتے ہیں۔ رسول پاک کا فرمان ہے: اللہ اس بندے کی مدد کرتا ہے جو دوسرے بندوں کی مدد کرتا ہے۔'' (ماخوذ)

PDF Compressor Free Version

اظہر نیر

Vill.&P.o. Barhulia, Via. Kansi Simri, Darbhanga 847106 (Mob. 9939749452)

گڑیا

چار سالہ نیلوفر نہانے کے نام سے بہت گھبراتی تھی، بڑی مشکل سے اس کی ماں اس کو غسل کراتی تھی۔ غسل کے نام پر بہت روتی اور پھر غسل کے بعد گھنٹوں روتی رہتی، اس وجہ سے اس کے والدین بہت پریشان تھے۔ آخر اس کے بدن پر پڑے دھول مٹی کو کیسے صاف کیا جائے۔ اس کے ڈر اور ضد کا کیا علاج ہو۔

اصل بات یہ تھی کہ نیلوفر نہانے سے بہت ڈرتی تھی۔ اس کی ماں اسے نہانے کے لئے غسل خانے میں چلنے کے لئے کہتی، مگر وہ روتی اور مچل جاتی، دیر تک روتی رہتی، ڈرانے، دھمکانے اور پیٹنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس کی ماں نے تنگ آکر اسے نہلانا ہی چھوڑ دیا۔ دو تین دن تک اس معاملے میں اس سے کوئی بات نہیں کی۔ بغیر غسل کئے اسکول چلی جاتی تھی۔ اسکول سے شکایت بھی آجاتی، مگر وہ غسل کرنے سے بہت ڈرتی تھی۔

اتفاق سے ایک روز نیلوفر کے ماموں جو نفسیات کے پروفیسر تھے، اس کے گھر آئے۔ نیلوفر کی ماں نے اپنے پروفیسر بھائی سے نیلوفر کا حال بتایا۔ پروفیسر نے نیلوفر سے بھی بات کی۔ نیلوفر نے اپنے ماموں سے کہا کہ مجھے بھی گندگی اچھی نہیں لگتی، مگر پانی سے بہت ڈر لگتا ہے۔

نیلوفر اسکول چلی گئی اور پروفیسر صاحب بازار گئے اور ایک بڑی سی پلاسٹک کی گڑیا خرید لائے اور نیلوفر کو تحفہ دیا۔ نیلوفر بہت خوش ہوئی۔ اسے اپنے سینے سے لگائے رکھتی، سوتی بھی تو گڑیا کو اپنے ساتھ ہی رکھتی تھی۔ پروفیسر صاحب نے اپنی بہن کو کہا:

''نیلوفر جب اسکول چلی جائے تو وہ پلاسٹک کی گڑیا کو تھوڑی سی گندگی لگا دیا کرے۔ یہ کام روزانہ کرے، پھر ایک دن نیلوفر سے کہے کہ تمہاری گڑیا بہت گندی ہوگئی ہے اس کو دور رکھو، تاکہ تمہارا کپڑا گندہ نہیں ہو۔''

نیلوفر گندی گڑیا کو اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی، مگر اس کی ماں نے نیلوفر کے ہاتھ سے لے کر کہا کہ گڑیا کتنی گندی ہوگئی ہے، اچھا میں اسے صاف کردوں گی، مگر نیلوفر نے گڑیا ماں کے ہاتھ سے چھین لی، بولی:

''میں خود اسے صاف کئے دیتی ہوں۔''

نیلوفر گندی گڑیا کو غسل خانے میں لے جا کر نہلانے لگی۔ گڑیا کو نہلانے کے سبب نیلوفر کا پورا کپڑا گیلا ہوگیا۔

نیلوفر کی ماں نے دیکھا کہ نیلوفر پوری طرح نہلا گئی تو وہ بھی اس کو نہانے لگی، اس طرح روزانہ نیلوفر گڑیا کو نہلانے میں محو رہتی اور اس کی ماں روزانہ اسے نہلا دیتی۔ اب نیلوفر اچھی لگنے لگی، اسکول سے بھی شکایت نہیں آتی۔ سبھی اس سے پیار کرتے، اب نیلوفر کو بات سمجھ میں آنے لگی تھی، اس کا ڈر جاتا رہا تھا۔

بچو! روزانہ غسل کرنے سے گندگی دور ہوتی ہے اور صحت اچھی رہتی ہے۔

اقوال زریں

☆ تحریر ایک خاموش آواز ہے اور قلم ہاتھ کی زبان ہے
☆ آدمی کی قابلیت زبان کے نیچے پوشیدہ ہے
☆ علم کی بنیاد جس پر ہے، عمل وہی ہے
☆ عقل کی حد ہو سکتی ہے، مگر بے عقلی کی نہیں
☆ سب سے بڑی مصیبت، مصیبت میں گھبرانا ہے
☆ کامیابی کا سب سے بڑا راز خود اعتمادی ہے
☆ تکلیف کے بعد راحت قانون قدرت ہے

PDF Compressor Free Version

احد پرکاش

ایم آئی جی ۳۰۴ پشم اپارٹمنٹ، بھارت ٹاکیز کے پاس، بھوپال، ایم۔پی (Mob. 9329412531)

تتلی، پھول اور بوندیں

ننھی منی تتلی کا نام رانو تھا۔ وہ سب سے بہت اچھی طرح ملتی تھی، کسی کی برائی نہیں کرتی تھی اور نہ ہی زیادہ بک بک۔ باغ میں بہت سارے پھول تھے، رنگ برنگے اور خوبصورت، ہر پھول چاہتا تھا کہ تتلی اس کے پاس آئے، اس سے بات کرے اور وہ ہر ایک پھول سے ملتی بھی تھی اور اس سے میٹھی میٹھی باتیں بھی کرتی تھی۔

اس کے بارے میں گلاب کہتا تھا، تتلی سب سے اچھی ہے۔ کنیر سب کو بتاتا تھا کوئی بات کرنا سیکھے تو اپنی رانو تتلی سے سیکھے۔ گیندا بولتا تھا سچ مچ اپنی تتلی جتنی خوبصورت ہے اتنی ملنسار اور اچھی بھی ہے۔

بچو، ایک دن بہت پانی برسا۔ نہ بھنورا آیا، نہ تتلیاں آئیں اور نہ ہی چڑیا آئی، طوطے میاں بھی نہیں آئے اور بیچارے پھول، اس دن سارے دن اداس رہے۔ وہ سب کے سب برسات میں بھیگتے رہے اور پانی کی بوندوں سے لڑتے رہے اور اس کی وجہ سے بہت سارے پھولوں کی پنکھڑیاں جھڑ کر زمین پر گر گئیں۔ انہیں بہت افسوس ہوا۔ انہیں رانو تتلی کی وہ کو بتایا دآ گئی۔

دکھ کرنے سے کیا ہوتا ہے
جو ہونا ، ہوتا ہے ، ہوتا ہے

تقریباً چار بجے کے وقت بوندیں رکیں۔ تبھی سورج ماما بھی آسمان سے جھانکے۔ کرنیں بھی آ گئیں۔ انہوں نے مسکرا کر باغ کی طرف دیکھا، لیکن باغ کو دیکھ کر انہیں اچھا نہیں لگا، کیوں کہ بہت سارے پھولوں کی پنکھڑیاں بوندوں سے ٹوٹ گئی تھیں۔

کرنوں نے پھولوں کی طرف دیکھا اور اپنی الفت دکھائی۔ اتنے میں رانو تتلی بھی آ گئی، بھونرے آ گئے، چڑیاں آ گئیں۔ سب کے سب آتے ہی باغ پھر سے خوبصورت لگنے لگا، لیکن اتنا نہیں جتنا پہلے تھا۔ بوڑھے مالی دادا بھی آ گئے۔ انہوں نے ساری پنکھڑیاں اکٹھا کر کے ایک کونے میں ڈال دیں، جن پھولوں کی وہ پنکھڑیاں تھیں انہیں بہت رونا آیا، لیکن تتلی سب کے پاس گئی، انہیں دلاسا دیا، سمجھایا دیکھو آج ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ کل ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بس

جب تک رہو، خوش رہو۔ پھولوں نے کہا: ''تتلی رانی اب ہماری خوبصورتی ختم ہوگئی ہے، ہم خوبصورت نہیں لگ رہے ہیں۔''

اب کی بار تتلی کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر گئے۔ اس نے ہمت کر کے کہا: ''باہر کی خوبصورتی تو کھونے والی ہوتی ہے، اپنے اندر جو خوبصورتی ہے، وہ نہیں کھونا چاہیے۔ تمہارے دوسرے ساتھی کتنے خوبصورت لگ رہے ہیں۔ تمہاری اپنی طرح وہ ابھی ابھی کھلے ہیں۔''

اتنے میں پھر بادل آ گئے۔ سورج ماما بھی اپنی ٹوپی لگا کر بھاگے۔

تتلیہ، بھنورے، چڑیاں، سب کے سب بوندوں کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ تتلی بھی اُڑ چلی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ کل صبح جب وہ باغ میں آئے گی تو یہ پھول نہیں رہیں گے، لیکن دوسرے، بہت سارے پھول کھل اٹھیں گے، جو اس کا استقبال کریں گے۔ بادل جو زور سے گرجا تو وہ سہم گئی۔ اس کا ننھا سا دل دھک دھک کر رہا تھا اور وہ بہت اداس ہوگئی تھی۔

PDF Compressor Free Version

انتخاب بن تنویر

59, Chuna Shah Colony, P.O.: Mango, Jamshedpur-831012

فرض شناسی

ایک کسان کو کھیت میں کام کرنے کے لئے مزدوروں کی ضرورت تھی، لیکن ایسی خطرناک جگہ، جہاں آئے دن آندھی طوفان آتے رہتے ہوں، یہی وجہ تھی کہ وہاں کوئی کام کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ کسان نے ایک دن شہر کے اخبار میں اشتہار دیا کہ اسے کھیت میں کام کرنے والے مزدور کی ضرورت ہے۔ کسان سے ملنے کئی لوگ آئے، لیکن جو بھی اس جگہ کے بارے میں سنتا، وہ کام کرنے سے انکار کر دیتا۔ آخر کار ایک عام قد کاٹھی کا دبلا پتلا نوجوان کسان کے پاس پہنچا۔

کسان نے اس سے پوچھا: ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''احمد علی۔''

نام سن کر کسان تھوڑا جھجکا۔ اس نے غور سے نوجوان کو دیکھا، پھر پوچھا:

''کیا تم یہاں کام کر سکتے ہو؟''

''جی ہاں..... بس جب ہوا چلتی ہے تب میں سوتا ہوں۔''

کسان کو اس کا جواب تھوڑا عجیب سا لگا، لیکن چونکہ اسے کوئی اور نہیں مل رہا تھا، اس لئے اس نے اسے کام پر رکھ لیا۔

مزدور محنتی تھا۔ وہ صبح سے شام تک کھیتوں میں محنت کرتا۔ کسان بھی اس سے کافی خوش تھا۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ایک رات اچانک زور و شور سے ہوا چلنے لگی۔ کسان سمجھ گیا کہ طوفان آنے والا ہے۔ وہ تیزی سے اٹھا، ہاتھ میں لالٹین لی اور مزدور کی جھوپڑی کی طرف دوڑا:

''جلدی اٹھو، طوفان آنے والا ہے، اس سے پہلے کہ سب کچھ تباہ ہو جائے کٹی ہوئی فصلوں کو باندھ کر ڈھانک دو اور باڑے کے گیٹ کو بھی رسیوں سے کس دو۔'' نوجوان مزدور بڑے آرام سے بولا:

''میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جب ہوا چلتی ہے تو میں سوتا ہوں.....''

یہ سن کر کسان کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ اس کے جی میں آیا کہ اسے گولی مار دے، لیکن ابھی تو اسے طوفان سے فصلوں اور دوسری چیزوں کو بچانا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے کھیت میں پہنچا، لیکن یہ کیا؟ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ فصل کی گانٹھیں اچھی طرح بندھی ہوئی تھیں اور ترپال سے ڈھانپ بھی دی گئی تھیں۔ اس کے گائے اور بیل محفوظ بندھے ہوئے تھے۔ مرغیاں اپنے دربوں میں تھیں۔ باڑے کا دروازہ بھی مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔ ساری چیزیں بالکل قرینے سے تھیں۔ نقصان ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ کسان اب مزدور کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا اور اب وہ بھی چین سے سو سکتا تھا۔

کسان سمجھ گیا کہ ہماری زندگی میں بھی کچھ ایسے طوفان یا ایسی پریشانیوں کا آنا طے ہے۔ بس ضرورت یہ ہے کہ اس مزدور کی طرح ہم بھی پہلے سے بچاؤ کی تیاری کر رکھیں تاکہ مصیبت آنے پر بھی ہم چین سے رہ سکیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی طالب علم شروع سے ہی پڑھائی کرے تو امتحانات کے وقت وہ آرام سے رہ سکتا ہے۔ چند گھنٹوں کے بعد طوفان تھم چکا تھا۔ صبح میں کسان نے احمد علی سے کہا:

''میں تم سے بہت خوش ہوں..... تم نے مجھے بہت بڑے نقصان سے بچا لیا۔''

''آپ مجھے جو مزدوری دیتے ہیں اس سے آپ کا حق بنتا ہے کہ میرے کام سے مطمئن رہیں اور میرا فرض بنتا ہے کہ اپنے مالک کو خوش رکھوں..... میں تو بس اپنے مالک حقیقی کا حکم بجا لاتا ہوں۔''

''بہت خوب! فرض شناسی کا ایسا سبق تم نے کہاں سے سیکھا؟''

''جی، اپنے نبی کی تعلیم سے۔''

''یہ نبی کیا ہوتا ہے؟''

''نبی مطلب پیغمبر.....''

''اچھا اچھا..... سمجھ گیا..... معاف کرنا احمد، تمہارے بارے میں پہلے میری رائے اچھی نہیں تھی، لیکن اب میری رائے بدل گئی ہے۔ تم نے اپنی ایمانداری اور فرض شناسی سے میری غلط فہمی دور کر دی..... اس دیش کو تمہارے جیسے نوجوان کی ضرورت ہے اور اس

(بقیہ ص ۸۰ پر)

PDF Compressor Free Version

فاطمہ جبیں

C/o. S.M. Sajjad, Kaghzi Mohalla, Near Bichli Masjid, Bihar Sharif 803101

عید

عید آئی ہے خوشیوں کا پیغام ہے
روزہ داروں کو قدرت کا انعام ہے

آج کی صبح ہر صبح سے ہے جدا
دل کھلے سب کے ہیں ، ہے معطر فضا

آج ملنے ملانے کا تہوار ہے
اور گلے سے لگانے کا تہوار ہے

دوستوں کو بلانا ہے آج اپنے گھر
ملنا دشمن سے بھی ہے گلہ بھول کر

عید کی ہر مکاں میں ہیں تیاریاں
بڑھ گئی ہیں مکینوں کی سرگرمیاں

ننھے بچے بھی کتنے سمجھدار ہیں
غسل کر کے سویرے سے تیار ہیں

وقت سجدوں کا نزدیک جب آ چلا
بن گیا بچوں بوڑھوں کا اک قافلہ

سب کے سب عید گاہوں کی جانب چلے
عطر میں ہیں بسے ان کے کپڑے نئے

مائیں ، بہنیں سویاں پکانے لگیں
میز پر دودھ لچھے سجانے لگیں

بچے کپڑے نئے جن کو حاصل نہیں
دوسرے بچوں سے ہیں وہ کچھ شرمگیں

پھر بھی خوشیاں منانے کو تیار ہیں
نا سمجھ کچھ ہیں ، کچھ ان میں ہوشیار ہیں

شکر خالق ادا کر کے آئیں گے جب
کھائیں گے ، دوستوں کو کھلائیں گے سب

دودھ لچھے کا کوئی نہ پوچھے مزا
سارے کھانوں سے ہے ان کی لذت جدا

آج تہواریوں کے وہ حقدار ہیں
مانگنے کو بزرگوں سے تیار ہیں

آج سب کی محبت ہے سب کے لئے
پیار ہے اور شفقت ہے سب کے لئے

وہ جو ہیں دور ان کے بھی انعام ہیں
آئے خط میں مبارک کے پیغام ہیں

عید ہے بچو! خوشیوں کی پیغامبر
ہم منائیں اسے آج جی کھول کر

آج کے دن کوئی غم میں ڈوبا نہ ہو
دیکھ لو پاس میں کوئی بھوکا نہ ہو

PDF Compressor Free Version

راحت جبیں

Rahat Road, Karim Chak, Chapra (Mob-9097801909)

اپنی مدد آپ

ایک چڑیا نے گیہوں کے کھیت میں گھونسلا بنایا اور جب انڈوں سے بچے نکلے تو کھیت بھی پکنے کے قریب تھا۔ ایک دن جب وہ دانے دُنکے کی تلاش میں جانے لگی تو اس نے بچوں سے کہا:

''میرے پیچھے اگر کھیت کا مالک یا اس کے گھر والے آئیں تو ان کی باتیں غور سے سن کر مجھے بتانا۔'' اس کے جانے کے ذرا دیر بعد کھیت کا مالک آیا اور اپنے بیٹے سے کہنے لگا: ''میں سمجھتا ہوں کہ کھیت پک چکا ہے۔ کل صبح ہی صبح اپنے دوستوں کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ کھیت کاٹنے میں ہماری مدد کریں۔''

جب چڑیا اپنے گھونسلے پر آئی تو بچے پَر پھیلا کر اور چیں چیں کر کے اُس کے آس پاس پھرنے لگے اور جو سنا تھا وہ کہہ سنایا اور بولے: ''اے ماں! ہمیں جلدی یہاں سے لے چل۔''

ماں نے کہا: ''بچو! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یاد رکھو جو کھیت کا مالک اپنے پڑوسیوں اور دوستوں پر بھروسا کرتا ہے، اس کا کھیت نہیں کٹتا۔ مجھے یقین ہے یہ کھیت کل نہیں کٹے گا۔''

دوسرے روز چڑیا پھر باہر گئی اور چلتے ہوئے کہتی گئی:

''بچو! کھیت کے مالک کی باتیں غور سے سن کر مجھے بتانا۔''

کچھ دیر بعد کھیت کا مالک آیا اور بہت دیر تک پڑوسیوں اور دوستوں کا رستہ دیکھتا رہا، لیکن وہاں کوئی بھی نہیں آیا۔ جب دھوپ تیز ہوگئی تو اس نے اپنے بیٹے سے کہا:

''ان دوستوں اور پڑوسیوں کا کوئی بھروسا نہیں۔ بہتر ہے کہ اب تم اپنے چچازاد بھائیوں سے کہو کہ کل صبح ہی صبح کھیت کاٹنے میں وہ سب ہمارا ہاتھ بٹائیں۔''

یہ سن کر چڑیا کے بچے بہت ڈرے اور جیسے ہی ان کی ماں آئی، وہ سب پر پھیلا کر، چیں چیں کر کے اس سے سب کچھ بتانے لگے۔

ساری بات سن کر چڑیا نے کہا: ''بچو! گھبرانے کی کوئی بات نہیں، مجھے بھروسا نہیں ہے کہ یہ رشتے دار اس کے کام نہ آئیں گے۔''

اگلے دن جب چڑیا دانے دُنکے کی تلاش میں جانے لگی تو اس نے کہا:

''بچو! کھیت کے مالک کی باتیں غور سے سن کر مجھے بتانا۔''

کچھ دیر بعد کھیت کا مالک وہاں آیا اور بہت دیر تک اپنے بھائی بھتیجوں کا انتظار کرتا رہا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں آیا۔ جب دھوپ تیز ہوگئی تو اُس نے اپنے بیٹے سے کہا:

''بیٹے! دیکھا ہماری مدد کو کوئی بھی نہیں آیا۔ اب تم دو درانتیاں تیز کر کے تیار رکھو۔ کل ہم اپنا کھیت خود ہی کاٹیں گے۔''

یہ سن کر چڑیا کے بچے بہت ڈرے اور جیسے ہی اُن کی ماں آئی تو پر پھیلا کر، چیں چیں کر کے اپنی ماں کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔

ساری باتیں سن کر چڑیا نے کہا: ''بچو! اب ہمیں یہاں سے ضرور چلے جانا چاہیے۔ یقین ہے کہ یہ کھیت اب کل ضرور کٹ جائے گا۔ جو آدمی اپنا کام آپ کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے، وہ کام ضرور انجام پاتا ہے اور اللہ کی مہربانی بھی شامل حال ہوتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اسی وقت اپنے بچوں کو وہاں سے دوسری جگہ لے گئی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح کھیت کا مالک آیا اور اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر کھیت کاٹنے لگا۔

چڑیا پہلے ہی اپنے بچوں کو وہاں سے لے جا چکی تھی۔

❁❁❁

فرض شناسی (ص ۷۸ سے آگے)

دیش کو ہی نہیں ساری دنیا کو تمہارے پیغمبر کی ضرورت ہے..... آج سے تمہاری مزدوری دوگنی رہے گی۔''

''شکریہ!'' اسے مزدوری دوگنی ہونے سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے اپنے کردار سے کسان کی رائے بدل دی۔

❁❁❁